

دین

فروری 2015

PDFBOOKSFREE.PK

اس کے ساتھ
کریں گے

کتاب

www.pdfbooksfree.pk

چاندنگروپ افہ پبلکیشنز

دکھن

رکن آل پاکستان نوز چہرہ زسوسائٹی
رکن کونسل آف پاکستان نوز چہرہ ڈائریکٹرز

MEMBER
APNS
CPNE

باقی ————— محمود باقر فیصل

نیکران ————— محمود ریاض

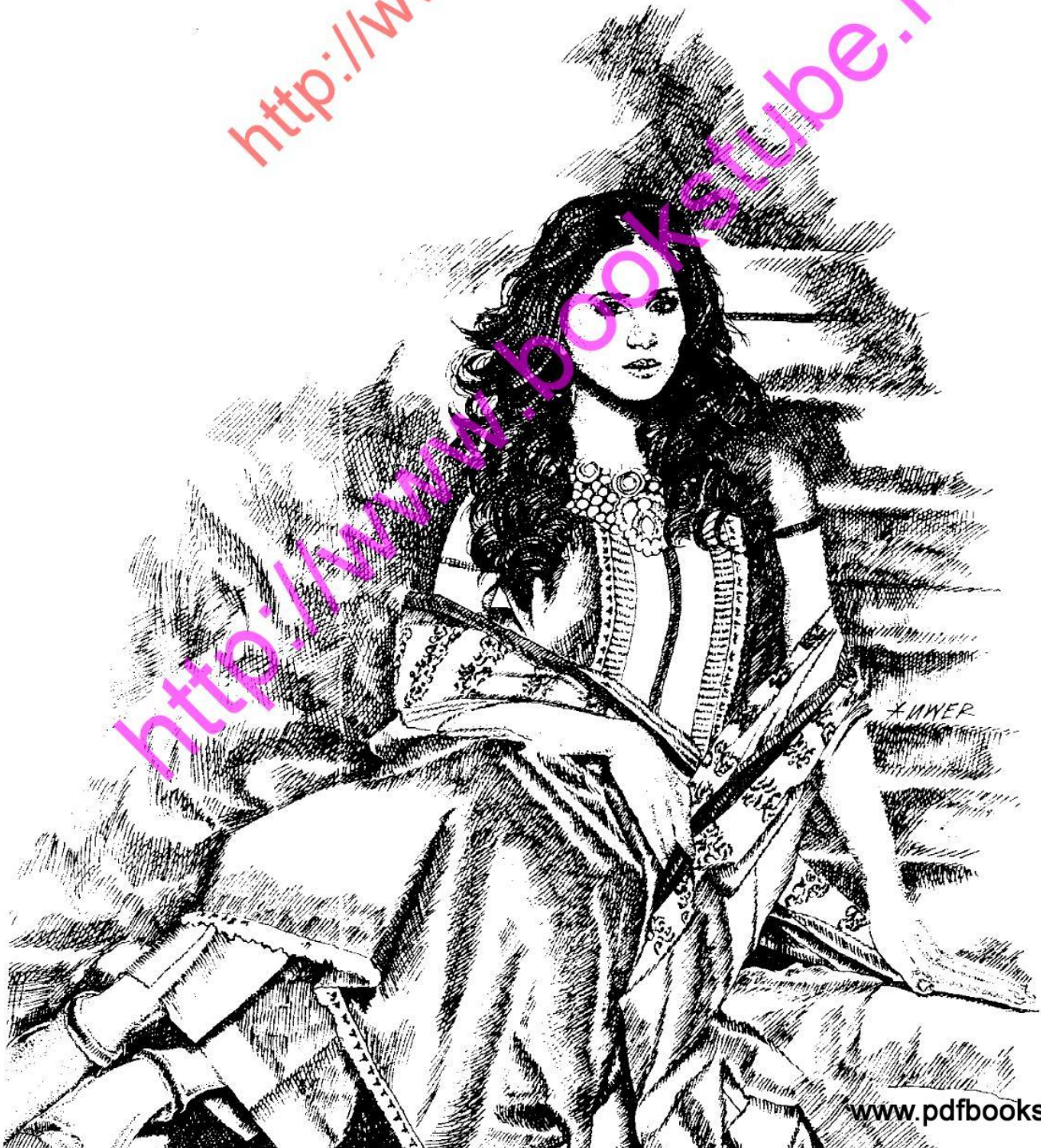
مدیرہ ————— نادرہ خاتون

مدیر اعلیٰ ————— عامر محمود

نائب مدیرہ ————— شعاع عمیر

مدیرہ خصوصی ————— اصتٰ الصبور

رشتہ نگار ————— خالدہ جیلانی



حمد
نعت
11 صدیق قتیق پوری
11 ناصر کاظمی



12 علی عباس سے ملاقات
23 آواز کی دُنیا سے
18 میری بھی سنئے
30 مُقابلہ ہے آئینہ
شاین رشید
عاطف مظہر
سیرین ہبانی
مقدس ریاب



144 درگم محبت
62 محبت خواب سویرا
شفیق افتخار
صدف ریکان



200 سال اٹھالا اور اوپر والا
221 جودل چلے گئے
251 چلو سنگ ہمارے
112 توبہ
فاخرہ گل
نازیہ جمال
عائشہ ناز علی
ام طیفور



51 بکھرے خواب
133 کوئی ستارہ سنبھال رکھنا
245 نیک سیتی
نور عین
عفت جیا
سیما بنت حاصم

رو سالانہ بکلیت دیگسٹری
پاکستان (شمال) ----- 700 روپے
ایشیا، افریقہ، یورپ ----- 5000 روپے
امریکہ، آسٹریلیا ----- 6000 روپے

ماہنامہ خواتین ڈائجسٹ اور ادارہ خواتین ڈائجسٹ کے تحت شائع ہونے والے رجوں ماہنامہ شعاع اور ماہنامہ کرن میں شائع ہونے والی ہر تحریر کے حقوق طبع و نقل بحال اور محفوظ ہیں۔ کسی بھی فرد یا ادارے کے لیے اس کے کسی بھی حصے کی اشاعت یا کسی بھی ٹی وی چینل پر ڈراما ڈرامائی تشکیل اور سلسلہ وار قسط کے کسی بھی طرح کے استعمال سے پہلے پبلشر سے تحریری اجازت لینا ضروری ہے۔ صورت دیگر ادارہ قانونی چارہ جوئی کا حق رکھتا ہے۔



281	خالہ جیلانی	کرن کا دسترخوان	272	شعاع عمیر	کرن کرن خوشنوں
283	اداری	حسن و صحت	275	بشری محمود	یادوں کے دیکھے سے
285	ذوالقرنین	نہلے یہ دہلا	277	شگفتہ سلیمان	مجھے شعر لیس رہا
286	مدیرہ کرن	نامے میں کے نام	278	اداری	مُسکراتی کرنیں

فروری 2015

جلد 37 شمارہ 11

قیمت 60 روپے

خط و کتابت کا پتہ

کرن

37- اردو بازار کراچی

خط و کتابت کا پتہ: 37- اردو بازار کراچی۔

پبلشر آزر ریاض نے ابن حسن پرنٹنگ پریس سے چھپوا کر شائع کیا۔ مقام: بی 91، بلاک W، نارتھ ناظم آباد، کراچی

Phone: 32721777, 32726617, 021-32022494 Fax: 92-21-32766872

Email: kiran@khawateendigest.com Website: www.khawateendigest.com



فروری 2015ء کا شمار آپ کے ہاتھوں میں ہے۔ سال 2015ء کا ماہ اول گزر گیا مگر سانحہ پشاور کے شہداء کی بازگشت ہوتی رہی۔ ماہ فروری البتہ اس حوالے سے منفرد ہے کہ 5 فروری کو پوری قوم یومِ یکجہتی منانے لگی۔ یہ دن آزادی کے ان متوالوں کے نام ہے جو گزشتہ نصف صدی سے زائد عرصے سے اپنی آزادی اور حق خود ارادیت کی جنگ لڑ رہے ہیں۔ بہت سے فوجیوں نے گل لالہ کی طرح اس دھرتی کی پیشانی کو سرخ کیا اور کئی ملت کے بیوت بھارتی ظلم و جبر کے آگے سیسہ پلائی ہوئی دروازے ہموئے ہیں۔ بتائیں ظلم کی یہ سیاہ رات کب کٹے گی مگر ہم یقینیت تو کم نا امید نہیں ایک روشن سیر اس رات کا سینہ جاک کر کے ضرور طلوع ہوگا۔ ضرورت صرف مسلسل جدوجہد اور اتفاق کی ہے۔ دعا ہے کہ ماہ فروری ہمارے ملک میں سلامتی اور امن و آسشتی کا بیغاں نہ لے۔ آمین۔

سائلگرہ نمبر

یوں تو کرن کا ہر شمارہ خاص شمارہ ہوتا ہے۔ اور ہم ہر شمارہ پوری محنت اور کوشش سے سجا سنا کر پیش کرتے ہیں مگر مارچ کا شمارہ سالگرہ نمبر ہوگا۔ مصنفین اور قارئین سے گزارش ہے وہ اپنی تحریریں جلد از جلد بھجوا دیں تاکہ سالگرہ نمبر میں شامل اشاعت ہو سکیں۔

اس شمارے میں

- ، ادا کاڑ علی عباس سے شاہین رشید کی ملاقات ،
- ، ادا کاڑہ "سبرین ہسانی" کہتی ہیں "میری بھی سینیے" ،
- ، "آواز کی دنیا سے" اس ماہ مہمان ہیں "عاطف مظہر" ،
- ، اس ماہ "مقدس رباب" کے "مقابل ہے آئینہ" ،
- ، "اک ساگر ہے زندگی" نعیمہ سعید کا سلسلے وار ناول ،
- ، "ردائے وفا" فرحین اظفر کا سلسلے وار ناول ،
- ، "دریچہ محبت" شفیق افتخار کے مکمل ناول کا دوسرا اور آخری حصہ ،
- ، "محبت، خواب، سویرا" صدق رحمان گیلانی کا مکمل ناول ،
- ، "تورہ" ام طیفور کا ناول ،
- ، "چلو سنگ ہمارے" عائشہ ناز علی کا ناول ،
- ، "جودل چاہے" نازیہ جمال کا ناول ،
- ، خالہ، سالارہ اور اوپر والا "فاخرہ گل کی دلچسپ مزاحیہ تحریر ،
- ، نور عین، محنت جیا اور سیاست عام کے افسانے اور مستقل سلسلے ،

ہفت

اس شمارے کے ساتھ کرن کتاب "کچن گارڈنگ" علیحدہ سے مفت پیش خدمت ہے۔



رستے میں مسافر کو تری یاد اگر ہے
پر لطف سفر ہے وہی پر لطف سفر ہے

تیرے بنا بنتا نہیں ہے کام کسی کا
محتاج ترا دہر میں ہر فرد و بشر ہے

سو کھے ہوئے اشجار کو کرتا ہے شمر و
رحمت سے تری سیر ہر اک شاخ و ثمر ہے

تیرے ہی کرم سے ہیں شب و روز نور
ہے شام اگر تیری تو تیری ہی سحر ہے

کوئی نہیں در ایسا جہاں ملتا سکوں ہو
عالم کے لیے جائے امل تیرا وہی در ہے

بن ملنگے عطا کر تلہے وہ شان ہے تیری
کیا کس کو ضرورت ہے تجھے سب کی خبر ہے

پاتا ہے سکوں آ کے تیرے گھر میں ہر انساں
محفظ ہر اک رنج و بلا سے ترا گھر ہے

مدیق فتح پوری



ترزین کائنات برنگِ دگر ہے آج
جشنِ ولادتِ شبہ جن و بشر ہے آج

صدیوں سے فرشِ راہ تھے جس کے لیے نجوم
آغوشِ آئینہ میں وہ رشکِ قمر ہے آج

صبحِ ازل کو جس نے دیا حسنِ لازوال
وہ موجِ نور زینتِ دیوارِ ودر ہے آج

کس کے قدم سے چمکی ہے بطحا کی ہر زمیں
ظلمتِ کدوں میں شورِ نویدِ سحر ہے آج

اے چشمِ شوقِ شوکتِ نظارہ دیکھنا
ماہِ فلک چراغِ مہرہ گزر ہے آج

شوقِ نظارہ نے وہ تراش ہے آئینہ
جس آئینے میں جلوہ آئینہ گر ہے آج

ناصر در حضور سے جو چاہو مانگ لو
وا خاص و عام کے لیے بابِ اثر ہے آج

علی عباس سے ملاقات

شاہین رشید

★ ”کیسے ہیں علی عباس؟“

✱ ”جی اللہ کا شکر ہے۔“

★ ”کیا مصروفیات ہیں آج کل؟ آن ایر کیا ہے اور

انڈر پروڈکشن کیا ہیں؟“

✱ ”آن ایر تو ”سسرال میرا“ اور ”لاڈو میں پلی“ ہے

اور مصروفیات میں ایک سیریل منول پروڈکشن کا کر رہا

ہوں ”مناہتا“ اس کا نام ہے ایک اور سیریل انجلیین

ملک ڈائریکٹ کر رہی ہیں اس کا نام ”کوریٹ روم“ ہے

اس میں میرا لائبرک کاردار ہے اور ڈرامہ بھی لائبرک ہی

Base کرتا ہے اس طرح اے اینڈ بی پروڈکشن کے

لیے بھی ایک سیریل انڈر پروڈکشن ہے ”کوئی میکے کو

دے دو سندیس“ یہ جیو کے لیے ہو گا۔ ایک سیریل

اے آر وائی ڈیجیٹل کے لیے بھی زیر تکمیل ہے۔“

★ ”ماشاء اللہ کالی کام کر رہے ہیں آپ۔ اور

”سسرال میرا“ آپ کا آن ایر ہے۔ اس سوپ میں

آپ کو بڑا نرم دل رہم دل اور محبت کرنے والا انسان

دکھایا گیا ہے۔ اصل میں کیسے ہیں؟“

✱ ”نرم دل نرم لہجے والا تو ہوں۔ مگر اصل زندگی میں

تھوڑا سا غصے والا بھی ہوں۔ لیکن جہاں تک خواتین

اور لڑکیوں کا سوال ہے تو میں ہمیشہ سے ان کی بہت

عزت کرتا ہوں۔ تو میرے کردار میں غصہ ہے مگر مجھ

میں غصہ نہیں ہے۔“

★ ”ہمارے ڈرامے کیا ہماری حقیقی زندگی سے میچ

کرتے ہیں؟“

✱ ”جی ہاں کرتے ہیں اور کافی حد تک کرتے ہیں۔

لیکن چونکہ ہمیں ڈرامے میں ناظرین کو کچھ سمجھانا

ہوتا ہے تو سچویشن کو تھوڑا سا بڑھا دیا جاتا ہے۔ اصل

زندگی میں خواتین کے ساتھ بہت کچھ ایسا ہوتا ہے جو



علی عباس کا انٹرویو کرنے سے پہلے مجھے قطعی یہ معلوم نہیں تھا کہ یہ ایک نامور شخصیت کے فرزند ہیں، کیونکہ فیلڈ میں میرا آنا جانا نہیں ہے ہاں ان سے ٹائم لیتے وقت مجھے اس بات پر ضرور حیرانی ہوئی تھی کہ آج کے دور کا یہ نوجوان اور اتنی شائستہ گفتگو اور لہجے میں احترام۔ بڑا اچھا لگا اور حقیقت ہمارے سینئر آرٹسٹ بہت اچھے ہیں۔ برسوں سے کام کر رہے۔ شہرت کی بلندیوں پر ہیں۔ مگر اس کے باوجود لہجے میں انکساری قائم ہے اور صحافیوں سے تعاون کا ہنر بھی پہلے جیسا ہی ہے۔ تو جب سینئر فنکار خود اچھے ہوں تو اولاد کیوں نہیں اچھی ہوگی۔ تو جناب علی عباس معروف فنکار و سیم عباس کے بیٹے اور عنایت حسین بھٹی کے پوتے ہیں۔

نہیں گیا۔ کیونکہ مجھے اس فیلڈ میں آنا تھا اس کے بعد اس سی اے جوائن کیا اور فلم اینڈ ٹیلی ویژن کی ڈگری حاصل کی۔

★ ”آپ نے کہا کہ وکالت اس لیے نہیں کی کہ جھوٹ بولنا پڑتا ہے تو اس کا اندازہ تو آپ کو پڑھائی کے پہلے دوسرے سال ہی ہو گیا ہو گا، پھر اس میں ڈگری کیوں لی؟“

★ ”یہ ڈگری میں نے صرف اپنے ابا کی خواہش پر لی ہے۔ دنیا میں واحد میرے ابا ہیں جن کی بات میں ٹال نہیں سکتا۔ اور میرے ابا کا یہ کہنا تھا کہ اگر میں اس فیلڈ میں آنا بھی چاہتا ہوں تو پہلے اپنی پڑھائی مکمل کروں۔ ان کی خواہش تھی کہ ایل ایل بی بھی کروں اور سی ایس ایس بھی کروں۔“

★ ”پڑھا کو تھے؟“
 ★ ”بہت پڑھا کو تو نہیں تھا مگر ان طالب علموں میں سے ضرور تھا جو سارا سال تو عیاشی کرتے تھے اور آخری دس پندرہ دن میں پڑھ کر پاس ہو جاتے تھے۔“
 ★ ”گڈ۔۔۔ اپنی فیملی کے بارے میں بتائیں والدین کے بارے میں؟ کہاں سے تعلق ہے آپ کا؟“
 ★ ”جی میرا تعلق تولہ پور سے ہے اور ابا میرے فلم

ہم اور آپ تک پہنچ ہی نہیں پاتا، تو ڈرامہ اصل زندگی کی ہی کہانی ہوتی ہے۔ ہمارے معاشرے کی ہی کہانیاں ہوتی ہیں۔“

★ ”چلیں جی آپ اپنے بارے میں کچھ بتائیے۔ پھر دیگر سوال بھی کریں گے؟“

★ ”جی میرا نام جیسا کہ آپ کو معلوم ہی ہے علی عباس ہے اور پیار سے مجھے سب ”بنٹی“ کہتے ہیں اور گیارہ فروری 1986ء لاہور میں میرا جنم ہوا اور ہائیٹ 5 فٹ 10 انچ ہے۔ میں گھر میں بڑا ہوں، پھر میری دو بہنیں ہیں اور ان کے بعد ایک چھوٹا بھائی ہے۔“

★ ”دیگر بھائی نہیں ہیں اس فیلڈ میں ہیں؟ اور تعلیم کتنی ہے؟“

★ ”نہیں جی۔۔۔ بس ایک میں ہوں اس فیلڈ میں جو آ گیا۔ اور میں نے ایل ایل بی کیا ہے اور وکالت میں نے کرنے کی کوشش کی مگر ہوئی نہیں کیونکہ اس پروفیشن میں جھوٹ بہت بولنا پڑتا ہے اور مجھے جو غصہ آتا ہے وہ جھوٹ پر ہی آتا ہے۔ اس لیے میں اس فیلڈ میں نہیں چل سکتا تھا۔ پھر میں نے سی ایس ایس کے پیپر دیے اور clear بھی کر لیے مگر میں انٹرویو کے لیے



تھیٹر اور فی وی کے ایکٹر ہیں سب انہیں ”وسیم عباس“ کے نام سے جانتے ہیں اور والدہ میری ہاؤس وائف ہیں۔“

★ ”پھر آپ کو تو اس فیلڈ میں آنے میں مشکل نہیں ہوئی ہوگی؟“

* ”نہیں جی۔۔۔ ایسا کچھ نہیں ہے۔۔۔ مجھے تو بہت مشکل ہوئی اس فیلڈ میں آنے کے لیے میرے ابا تو چاہتے ہی نہیں تھے کہ میں شویز میں آؤں۔“

★ ”کیوں؟“ ”خود تو انہوں نے پیسہ بھی کمایا اور نام بھی؟“

* ”بات یہ ہے کہ اب تو یہ ایک انڈسٹری بن گئی ہے جبکہ جس زمانے میں انہوں نے کام کیا اور نام کمایا اس زمانے میں شویز انڈسٹری نہیں تھی۔ لیکن الحمد للہ انہوں نے اپنی محنت سے نام کمایا وہ بڑے اشارے تھے اور ہیں اور انشا اللہ رہیں گے۔ اللہ انہیں لمبی زندگی عطا کرے۔ وہ منع اس لیے کرتے تھے کہ اس فیلڈ میں غیر یقینی صورت حال بہت زیادہ ہوتی ہے۔ یعنی ایک دن میں اگر آپ بادشاہ ہیں تو دوسرے دن فقیر۔۔۔ تو وہ اس بات سے ہمیشہ گھبراتے تھے۔ اور اس لیے انہوں نے میری پڑھائی یہ بہت زیادہ توجہ دی اور جب میں نے اس فیلڈ کو جو آئن کیا تو ہم دونوں کے درمیان یہ بات تمہ پائی تھی کہ ہم دونوں ایک دوسرے کے معاملات میں نہیں بولیں گے پروفیشنلی اور ہمیشہ بہترین دوست کی طرح رہیں گے اور اس لیے انہوں نے بھی کہیں میرا ذکر نہیں کیا اور نہ ہی مجھے ریفرنس دینے کے لیے کہا۔ میں جو کچھ بھی آج ہوں۔ جو بھی میری تھوڑی بہت پہچان ہے وہ میری اپنی وجہ سے“

میں خود سے نکلا، خود سے کام ڈھونڈا خود ہی جا جا کے آڈیشن دیے لوگوں کو اسٹیسٹ کیا اور پھر اس کام میں آیا۔“

★ ”تو گویا آپ چاہیں گے کہ آپ کی اپنی پہچان ہو۔ لوگ یہ نہیں کہیں کہ یہ وسیم بھائی کے بیٹے ہیں بلکہ یہ کہیں کہ وسیم عباس ان کے والد ہیں؟“

* ”مجھے بہت فخر ہوتا ہے جب میں اپنے والد کے نام

سے پہچانا جاتا ہوں لیکن میں یہ بھی چاہوں گا کہ میری اپنی ایک پہچان ہو۔ اب جیسا کہ آپ کو بھی نہیں معلوم تھا کہ میں ان کا بیٹا ہوں۔ آپ نے میرا کام دیکھ کر مجھ سے رابطہ کیا تو اس لیے میں اپنی پہچان بنانے کی کوشش کر رہا ہوں اور مجھے یقین ہے کہ میرے ابا کو بھی یہ بات پسند آئے گی کہ ان کا بیٹا اپنے کام سے پہچانا جائے۔“

★ ”پہلا پروگرام یا ڈرامہ کونسا تھا اور شہرت کس ڈرامے کی آپ کو؟“

* ”جب میں طالب علم تھا تو ایک شو ہوتا اس میں ایک پروگرام ہوتا تھا گیارہ نمبر اس پروگرام میں لوگوں سے کافی بد تمیزی کرنی ہوتی تھی۔ وہ میں نے کیا اور پھر بہ حیثیت اداکار کے جو بہتر کام مجھ سے ہوئے ان میں ’سسرال میرا‘ ہے اور ’لاڈلوں میں ملی‘ ہے اور ان دونوں سیریلز کی بدولت مجھے پہچان ملی اور لوگ آؤ گراف بھی لیتے ہیں اور تصویر بھی کھینچتے ہیں۔“

★ ”آپ نے شاید اسسٹینٹ ڈائریکٹر کا بھی تو کام کیا تھا؟“

* ”جی میں نے معروف فنکار فیصل رحمن کے ساتھ بہ حیثیت اسسٹینٹ ڈائریکٹر کے کام کیا تھا اور مجھے اس کام کے 5000 ہزار ملے تھے۔ دو دن کام کیا تھا اور دو دن کے اس معاوضے کو میں نے یوں خرچ کیا کہ دو ہزار اپنی والدہ کو دیئے اور تین ہزار کے اپنے لیے جوتے خریدے تھے۔“

★ ”بہت شوق سے اور اپنی ڈگریوں کو ایک طرف رکھ کر آپ اس فیلڈ میں آئے ہیں۔ سب اچھا اچھا نظر آ رہا ہے یا کچھ برا بھی نظر آ رہا ہے؟“

* ”برائی تو معاشرے میں ہر جگہ برے شویز میں بھی ہے اور مجھے جو سب سے بڑی برائی نظر آتی ہے وہ یہ کہ اس فیلڈ کو لوگوں نے قبول نہیں کیا ہے لوگ اداکاروں کو دیکھ کر خوش ہوتے ہیں۔ ان سے ملنا بھی چاہتے ہیں لیکن جہاں وہ اپنی بحث ہار رہے ہوتے ہیں۔ یعنی وہ یہ کہہ دیتے ہیں کہ آپ تو اداکار ہیں مجھے تجپن میں اس بات پر بہت غصہ آتا تھا جب لوگ کہتے تھے کہ چونکہ

محسوس کی؟

* ”میں نے بہت ساری باتیں نوٹ کی ہیں۔ جھوٹ کے بارے میں تو آپ کو بتایا ہے۔ پھر یہ کہ قانون کی پردہائی کرنے کے بعد جب میں پریکٹس کرنے نکلا تو میں نے دیکھا کہ ہمارے یہاں کوئی قانون فالو نہیں ہوتا۔ ہر بندہ اپنا ہی قانون لے کر چل رہا ہے اور اسے کوئی روکنے ٹوکنے والا نہیں ہے۔ ہمارے معاشرے کی جو پستی ہے اس کی وجہ بھی یہی ہے کہ اگر قانون نافذ ہے تو صرف کتابوں میں اصل زندگی میں اس کی کوئی اہمیت نہیں ہے۔“

★ ”حسد کرتے ہیں یا رشک؟“

* ”رشک تو ضرور کرتا ہوں مگر اللہ کا شکر ہے کہ حسد نہیں کرتا اور اللہ نے مجھ میں یہ بہت بڑی خوبی ڈالی ہے کہ مجھے کسی کو دیکھ کر کسی بھی قسم کی کوئی جھلسی نہیں ہوتی، میرے پاس جو گاڑی ہے جو فون ہے جو کمرہ ہے جو گھر ہے اس کے لیے میں اپنے رب کا بہت شکر ادا کرتا ہوں۔“

★ ”سب کو کام کے سلسلے میں تعریف ہی پسند ہوتی ہے۔ آپ کو بھی پسند ہوگی۔ کبھی تنقید کا سامنا بھی ہوا؟“

* ”بالکل نہیں ہوا اور آپ یقین نہیں کریں گی کہ تنقید مجھے تعریف سے زیادہ پسند ہے۔ مگر کوئی کرتا ہی نہیں۔ شاید سب کو میرا کام زیادہ پسند آتا ہے۔ اور یہ میرے رب کی مجھ پر بہت بڑی عنایت ہے۔“

★ ”بجٹ بنا کر خرچ کرتے ہیں؟“

* ”نہیں جی۔۔۔ کوئی بجٹ نہیں کوئی پلاننگ نہیں۔ میرے پاس جتنے پیسے آتے ہیں وہ سب کے سب خرچ کر دیتا ہوں، میں اپنی مرضی سے کھانا کھاتا ہوں۔ اپنی مرضی سے گھومتا پھرتا ہوں اور یہ بھی سوچتا ہوں کہ پیسے جمع کرنے کا کوئی فائدہ نہیں۔ کیونکہ زندگی کا کوئی بھروسہ نہیں۔ اس لیے جو آ رہا ہے اس کو خرچ کر کے اس پل کو انجوائے کیا جائے۔ بجٹ کا کام میری بیوی کرتی ہے اور وہ ہی ”کل“ کے بارے میں سوچتی ہے۔“

★ ”کرائسٹس میں وقت گزارا؟“

تم ایک اداکار کے بیٹے ہو اس لیے اداکاری ہی کر رہے ہو گے۔ حالانکہ ایسا کچھ نہیں تھا۔ تو جہاں کوئی ہمارے لگتا ہے تو وہاں یہ وہ شو بیز کو بری جگہ سمجھ کر اپنے آپ کو Superior سمجھنے لگتا ہے۔ اور مجھے ہمیشہ سے ہی اس بات پر غصہ آتا ہے۔ اس لیے جب میں پڑھے لکھے لوگوں کے ساتھ کام کرتا ہوں تو مجھے خوشی ہوتی ہے کہ میں پڑھے لکھے لوگوں کے ساتھ کام کر رہا ہوں۔“

★ ”اب تو یہ انڈسٹری بن گیا ہے میڈیا تو ظاہر ہے کہ پڑھے لکھے لوگ بھی شامل ہو گئے ہیں۔ یہ بتائیں گھر کے بڑے ہیں تو گھر کو رونق بخشی؟“

* ”تقریباً جی میں آپ کی بات سمجھ گیا ہوں اور میری شادی ماشاء اللہ سے دو سال پہلے ہو گئی ہے اور میرے ابا کو جلدی تھی کیونکہ انہیں ”دادا“ بننا ٹھاسو ان کی اس خواہش کو بھی پورا کر دیا اور ماشاء اللہ سے میری ایک بیٹی ہے جس کا نام ”پریسہ“ ہے Parisa اور الحمد للہ وہ ایک سال کی ہے اور میری شادی میرے والدین کی پسند سے ہوئی ہے۔“

★ ”اچھا دیری گڈ۔ پھر تو گھر والوں سے تعلقات بہت اچھے ہوئے گئے؟“

* ”الحمد للہ بہت اچھے تعلقات ہیں مگر پھر بھی کہیں نہ کہیں اختلافات کی گنجائش نکل ہی آتی ہے۔ میری فیملی لاہور میں ہوتی ہے اور میں کراچی میں۔ تو فیملی کو مس کرتا ہوں۔ خاص طور پر اپنی بیٹی کو بہت مس کرتا ہوں۔“

★ ”کوئی شکایت گھر والوں سے؟ یا کوئی بات جو بری لگتی ہو؟“

* ”میں اپنے گھر والوں سے بہت مختلف ہوں۔ اس لیے گھر والوں کی بہت سی باتیں مجھے بری لگتی ہیں۔ میں بہت صاف گو بندہ ہوں اور کسی کو بھی صاف گوئی پسند نہیں ہوتی۔ تو گھر والوں کو میری باتیں بری لگتی ہیں اور مجھے گھر والوں کی باتیں بری لگتی ہیں۔“

★ ”وکالت آپ نے پڑھی اور بقول آپ کے کہ اس پیشے میں جھوٹ بہت ہے اور کیا بات آپ نے

* ”جی میں نے بہت برا وقت بھی گزارا ہے کیونکہ ہماری فیلڈ میں Acceptance نہیں ہے اور میں اپنے ابا کی سوچ کے بغیر آیا۔ مجھے بہت فرسٹریشن رہی میں نے اپنے کام کا پہلا سال بہت برا گزارا اور بہت دعا میں مانگیں، بہت محنت کی اور وہ میری زندگی کا شاید بہت برا وقت تھا، مگر شاید اچھا بھی ہو، کیونکہ اسی پریڈ میں میں نے بہت محنت بھی کی۔“

* ”ڈرامے کا کوئی کردار جو یادگار بن گیا ہو؟“
* ”ابھی کچھ ہی عرصے کی بات ہے۔ سیریل ”انتہا“ میں میرا کردار ایک سر پھرے لڑکے کا ہے جو وقت کے ساتھ ساتھ نفسیاتی ہو جاتا ہے اور جب پہلی شوٹ کی عدنان والی قہقہے کے ساتھ تو میری ان سے کچھ زیادہ ہیلو ہائے نہیں بھی۔ تو جب شوٹ ہو گئی تو سب نے بہت تعریف کی اور عدنان نے مجھ سے بہت سیریس سوال پوچھا کہ جو شاید مجھے ساری زندگی یاد رہے گا کہ ”کیا تم نے پہلے بھی کوئی نفسیاتی کردار کیا ہے؟“ اور یہ سوال انہوں نے مجھے ایک کونے میں لے جا کر کہا۔ میں نے کہا نہیں۔ تو کہنے لگے ”تم نے بہت اچھا پرفارم کیا ہے۔“

* ”ڈراموں میں کام کرنے والے خود اپنا ڈرامہ نہیں دیکھ پاتے آپ دیکھتے ہیں؟“
* ”اپنے ڈرامے بھی دیکھتا ہوں۔ دوسروں کے بھی دیکھتا ہوں، کیونکہ یہ میرا پروفیشن ہے میری study ہے مجھے سیکھنا ہے اور فلمیں بھی میں بہت زیادہ دیکھتا ہوں اور بہت دل چاہتا ہے کام کرنے کا اور ان شاء اللہ ضرور کروں گا۔“

* ”کردار کونسا کرنا چاہتے ہیں۔ کوئی خواہش کوئی آرزو؟“

* ”میں سمپل ہیرو نہیں بننا چاہتا۔ میں بہت پاور فل رول کرنا چاہتا ہوں، ایسے کردار جس میں ایکٹنگ کا مار جن ہو اور ”انتہا“ کے اندر جو کردار کر رہا ہوں ویسے کردار بھی کرنا چاہتا تھا اور اللہ کا شکر ہے کہ مجھے ایک اچھا کردار کرنے کو ملا۔ اب دعا ہے کہ ناظرین کو بھی میرا کام پسند آئے۔“

* ”سی کردار کو کر کے پچھتاوا ہوا؟“
* ”جی بالکل ہوا میں اس ڈرامے کا نام نہیں لے سکتا کیونکہ بری بات ہو جائے گی اس میں بہت ہی سمپل کردار ہیں۔ اسے کر کے پچھتا رہا ہوں۔ بس وہ ایک ہیرو ہے۔“

* ”آپ ہر ڈرامے میں ایک عدد چھوٹی ڈاڑھی کے ساتھ ہوتے ہیں کیا اسے مستقل رکھیں گے؟“
* ”فی الحال تو مستقل ہے کیونکہ اگر اسے میں نے صاف کر دیا تو میں بہت ہی کم عمر ”پپو“ لگوں گا۔ اس لیے فی الحال یہ چلے گی۔“

* ”اپنے مستقبل کے لیے کیا سوچتے ہیں۔ کیا پلاننگ کی ہے آپ نے؟“

* ”مجھے بہت محنت کرنی ہے بہت بڑا نام بنانا ہے اپنا۔ اپنے دادا اور ابا کی طرح اپنا نام بنانا ہے اور اپنے ماں باپ کی خدمت کرنی ہے اور اپنی بیٹی کی بہت ہی اچھی تعلیم و تربیت کرنی ہے اور ڈائریکشن میں بھی آنے کا ارادہ ہے جیسا کہ میں نے آپ کو پہلے بھی بتایا۔ لیکن ابھی نہیں بلکہ سال دو سال بعد۔“

* ”مارننگ شو میں نظر نہیں آتے۔ پسند نہیں ہے کیا؟“

* ”اتفاق ہے کہ نہیں جاسکا۔ لیکن ویسے مجھے مارننگ شو اچھے بھی نہیں لگتے۔ میرا تو خیال ہے کہ انہیں بند ہو جانا چاہیے۔“

* ”کھانے پینے میں دسی کھانے پسند ہیں یا بدیسی؟“
* ”دسی کھانے بہت پسند ہیں اور ہاتھ سے کھانا کھانا اچھا لگتا ہے۔“

* ”شہرت کب مسئلہ بنتی ہے؟“

* ”جب آپ کسی سے چھپنا چاہتے ہیں۔ سوریہ لوگ کیا کہتے ہیں۔ پیار ہی کرتے ہیں ہم سے۔“
اور اس کے ساتھ ہی ہم نے علی عباس سے اجازت چاہی۔ اس شکریے کے ساتھ کہ انہوں نے ہمیں ناظم دیا۔



الحق

ابن سیرک کریم



SC-004-14

facebook.com/snscares



www.pdfbooksfree.pk

سیرین ہسبانی

مشاہیر کشید

- 1 "میرا نام؟"
- "سیرین ہسبانی۔"
- 2 "پسندیدہ نام؟"
- "یہی، جو والدین نے رکھا۔"
- 3 "پیار کا نام؟"
- "صبا۔"
- 4 "وہ دن جب دنیا میں آئی؟"
- "دن تو مجھے نہیں پتا۔ البتہ 10 ستمبر کو اس دنیا میں آئی۔"
- 5 "اپنی ایک عادت جو پسند نہیں؟"
- "ہر کام سے جلدی گھبرا جاتی ہوں۔ کوئی کام مسلسل نہیں کر پاتی۔"
- 6 "مجھ میں کمی ہے؟"
- "قوت فیصلہ کی۔ اپنے اوپر اعتماد نہیں لگتا ہے کہ"
- 10 "شادی میں پسندیدہ رسمیں؟"
- "مجھے شادی کی ساری رسمیں اچھی لگتی ہیں اور سندھ کی تو رسمیں بہت خوب صورت ہیں۔ ہم نے صنم کی شادی میں تمام رسمیں کیں مگر بہت سادگی کے ساتھ۔"
- 11 "بہت کوفت ہوتی ہے؟"
- "جب میں وقت پر پہنچ جاؤں اور شوٹ کے لیے دوسرے لوگ نہ آئیں۔۔۔ مجھے انتظار کرنے میں بہت کوفت ہوتی ہے۔"
- 12 "موڈ خراب ہو جاتا ہے؟"
- "جب مجھے وقت پر کھانا نہ ملے یا وقت پہ کھانا تیار نہ ہو اور کوئی کام وقت پر شروع نہ ہو۔"
- 13 "اپنے لیے کن چیزوں پہ خرچ کرتی ہوں؟"
- "پرفیومز، بیگز اور جوتے۔۔۔ کہیں چلی جاؤں ان





چیزوں کی شاپنگ کیے بغیر تو گھر آتی ہی نہیں ہوں۔“

14 ”میری ایک اچھی عادت؟“

”میں جھوٹ نہیں بولتی۔“

15 ”مذہب سے لگاؤ؟“

”بہت زیادہ۔۔۔ مگر نماز پڑھنے میں کوتاہی ہو جاتی

سے، کوشش کرتی ہوں کہ اس میں باقاعدگی لے آؤں۔“

16 ”میری ایک بات جو مجھے دوسروں میں نمایاں

کرتی ہے؟“

”میں بہت نرم دل اور نرم لہجہ رکھتی ہوں۔

میرے بات کرنے کا انداز سب کو بہت پسند ہے۔“

17 ”مجھے یقین ہے کہ؟“

”کہ ہر انسان کو اس کی قسمت میں لکھا ہوا ہی ملتا

ہے۔ کوئی کسی سے اس کی کوئی چیز چھین نہیں سکتا۔“

18 ”اپنے ڈراموں میں میرے پسندیدہ ڈرامے؟“

”ہوں۔۔۔ مشکل سوال ہے۔ ویسے مجھے اپنا سب

سے پہلا ڈرامہ ”پانی“ اور پھر یاسر نواز کی ڈائریکشن میں

”ادھوری محبت“ مجھے بہت پسند ہے۔“

19 ”وہ لڑکے برے لگتے ہیں؟“

”جو عورت کی کمائی پر گھر چلاتے ہیں۔ دعوت میں

جائیں یا ویسے آؤٹہنگ کے لیے جائیں تب بھی بل

لڑکی دے تو بہت برے لگتے ہیں اور ہاں وہ لڑکے یا مرو

بھی برے لگتے ہیں جو لڑکیوں کو خواہ مخواہ ہی بلیک میل

کریں۔“

20 ”میری سبج کی روٹین؟“

”پانی پیتی ہوں اور پھر اپنا سیل فون چیک کرتی ہوں

ضروری SMS ہوتو جواب بھی دے دیتی ہوں۔“

21 ”اپنے کیے گئے فیصلوں پہ میری رائے؟“

”تقریباً ”جو بھی فیصلے کیے سب کے سب غلط ثابت

ہوئے۔ اب سب سے مشورہ کر کے ہی کوئی کام کرتی

ہوں۔“

22 ”کن باتوں سے ڈرتی ہوں؟“

”کہ کوئی اسکینڈل نہ بن جائے۔ کیونکہ کچھ بے

گناہ لوگ بھی پھنس جاتے ہیں۔ اور یہ کہ مجھ سے کوئی

ایسی غلط سرزد نہ ہو جائے کہ دوسروں کے لیے پریشانی کا

باعث بنے۔“

23 ”خرج میں کنجوسی نہیں کرتی؟“

”جب امی اور چھوٹی بہن شاپنگ پہ میرے ساتھ

ہوں۔ دل چاہتا ہے یہ ڈھیر ساری شاپنگ کریں۔“

24 ”دھی ہوئی ہوں تو؟“

”اپنے آپ کو کمرے میں بند کر لیتی ہوں۔“

25 ”میں بجل سے کام نہیں لیتی؟“

”دوسروں کی تعریف میں بجل سے کام نہیں لیتی۔

جس طرح میرا دل چاہتا ہے کہ لوگ میری تعریف

کریں اس طرح دوسروں کا بھی دل چاہتا ہے کہ ان

کے اچھے کاموں کی تعریف ہو۔“

26 ”سیاست دان جو مجھے پسند ہیں؟“

”نیلسن منڈیلا اور مہاتیر محمد۔“

27 ”اگر اس فیلڈ میں نہ ہوتی تو؟“

”تو یقیناً ”میں تدریس کے شعبے سے وابستہ ہوتی۔

کیونکہ مجھے ٹیچنگ کا شعبہ بہت اچھا لگتا ہے اور

بہت اچھی ٹیچر ثابت ہوتی۔“

28 ”جن پر مجھے اندھا اعتماد ہے؟“

”اپنی بہن فہم بلوچ اور اپنی ماں پر۔ ان پر میں کسی

کامیابیوں کے پیچھے میرے بھائیوں کا ہاتھ ہے۔ اگر وہ منع کرتے یا سختی کرتے تو میں کبھی اس فیلڈ میں نہ ہوتی۔“

38 ”زندگی میں ایک بار ملنا چاہتی تھی؟“

”مدر ٹریسا، نیلسن منڈیلا اور مرزا غالب۔“

39 ”لڑکوں سے کسنا چاہتی ہوں؟“

”کہ ارے نادانوں لڑکیوں کے پیچھے پڑ کر کیوں اپنا وقت ضائع کرتے ہو۔ ردھو لکھو اور اپنا فیوچر بناؤ۔“

40 ”اپنے گھر کے کس کونے میں سکون ملتا ہے؟“

”صرف اور صرف اپنے کمرے میں سکون ملتا ہے۔“

”وہ تو پورے گھر میں سکون ہے مگر اپنے کمرے کی تو بات ہی الگ ہے۔“

41 ”ایک کردار جو کرنا چاہتی ہوں؟“

”مجھے تھر کی عورت کا کردار کرنے کی بہت زیادہ خواہش تھی اور ڈرامہ سیریل ”سنجھنا“ میں میری یہ خواہش پوری ہوئی۔ اب تو جو مل جائے کر لیتی ہوں۔“

”مگر وہ کردار کرتی ہوں جو پاؤں تل ہوں۔“

42 ”مجھے رشک آتا ہے؟“

”ملائیشیا اور انڈیا کی ترقی دیکھ کر ہمارے ساتھ کے ملک ہیں اور ان ملکوں نے کتنی ترقی کی ہے۔ اور ہم۔۔۔“

43 ”رنگ اور لباس کے معاملے میں؟“

”بہت چوڑی ہوں۔ رنگوں میں کالا اور سفید رنگ کو ترجیح دیتی ہوں اور لباس میں خاص خیال رکھتی ہوں کہ صاف ستھرا، استری کیا ہوا ہو اور ایسا نہ ہو کہ جسم نمایاں ہو۔“

44 ”کس طرح کی موویز دیکھتی ہوں؟“

”ہر طرح کی دیکھ لیتی ہوں۔ لیکن مجھے ایرانی طرز کی انگریزی موویز بہت پسند ہیں۔ اس زمانے کے لباس، ان کارہن سن مجھے بہت متاثر کرتے ہیں تو اس لیے ایرانی موویز ضرور دیکھتی ہوں۔“

45 ”ایس ایم ایس کرنا پسند ہے یا فون کرنا؟“

”مجھے فون کرنا پسند ہے۔ لیکن اگر کسی کا ایس ایم ایس آجائے اور کوئی ضروری بات پوچھی ہو تو جواب

قسم کا شک بھی نہیں کر سکتی۔“

29 ”کن سیاست دانوں سے شکایت ہے؟“

”سب سے کیونکہ کسی نے اس ملک کے لیے کچھ نہیں کیا۔ سب ہماری دھرتی پر بوجھ ہیں۔ اللہ انہیں نیک ہدایت دے۔“

30 ”بارش انجوائے کرتی ہوں؟“

”اپنے گھر والوں کے ساتھ۔ اور اچھے موسم میں گھر سے باہر ہوتی ہوں تو دل چاہتا ہے کہ اڑ کر گھر پہنچ جاؤں۔“

31 ”فیوچر پلاننگ؟“

”کچھ خاص نہیں۔ بس زیادہ سے زیادہ کام کرنا چاہتی ہوں۔ زیادہ سے زیادہ ڈرامے کرنا چاہتی ہوں اور ماشاء اللہ آج کل کر بھی رہی ہوں۔“

32 ”تاریخ سے لگاؤ (History)؟“

”بہت زیادہ لگاؤ ہے۔ تاریخ کی کتابیں بھی پڑھتی ہوں۔ اور پھر اپنے آپ کو اس دور میں محسوس کرتی ہوں۔“

33 ”پسندیدہ تاریخی دور؟“

”سچ بتاؤں۔۔۔ مجھ میں تو پرانی روح ہے۔ اور مجھے لگتا ہے کہ میں اس دور میں آن فٹ ہوں۔ اس لیے مجھے سب تاریخی دور اچھے لگتے ہیں۔“

34 ”کن کھانوں کو ہمیشہ کھانا چاہتی ہوں؟“

”دال چاول۔ اور کسی بھی انداز میں کپے ہوئے“

35 ”24 گھنٹوں میں کونسا وقت اچھا لگتا ہے؟“

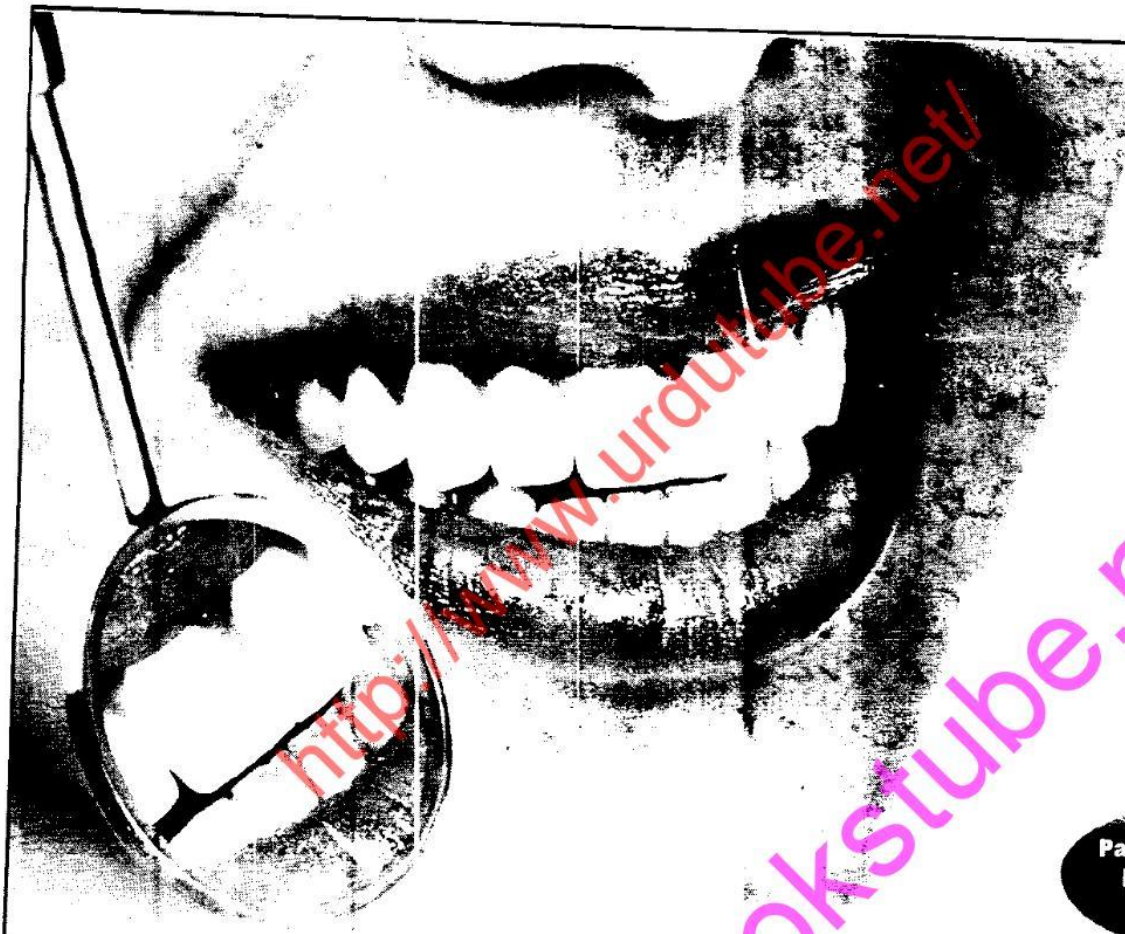
”شام کا اور پھر رات کا۔ بہت سکون کا وقت ہوتا ہے۔“

36 ”میری صبح کب ہوتی ہے؟“

”صبح۔۔۔ سچ بتاؤں۔۔۔ میری تو صبح آنکھ ہی نہیں کھلتی، کیونکہ مجھے صبح جلدی اٹھنے کی عادت نہیں ہے۔“

37 ”ہر کامیاب مرد کے پیچھے ایک عورت کا ہاتھ ہوتا ہے اور ہر عورت کے پیچھے؟“

”بالکل ہوتا ہے کسی نہ کسی کا ہاتھ اور میری



Pakistan's ONLY
Baking Soda
Toothpaste



دانت سفید چاک

اور مہینوں میں فروری اور دسمبر۔ فروری چھوٹا ہوتا ہے اور دسمبر سال کا آخری مہینہ ہوتا ہے۔“
53 ”گھر کے کام جو کرنے کو دل نہیں چاہتا؟“
”بقیمہ۔۔۔“ ”گھر کے کام۔۔۔ سچ کسی کام کو کرنے کو دل نہیں چاہتا۔ اس لیے کام کرنے والیاں رکھی ہوئی ہیں۔“

54 ”اغوا کرنا چاہتی ہوں؟“
”سب سیاست دانوں کو اور تادان میں ان کی دولت لے کر قومی خزانے کو بھرتا چاہتی ہوں۔“
55 ”کون سا مشروب مزے لے لے کر پیتی ہوں؟“
”پانی آپ یقین کریں۔ جب میں پانی پیتی ہوں تو میرے ساتھ بیٹھے ہوئے لوگ کہتے ہیں کہ ایسا لگتا ہے کہ جیسے تم بہت ہی لذتِ شراب پی رہی ہو تو میں ہتی ہوں کہ بھلا پانی سے بڑھ کر کوئی مشروب کیا لذتِ ہو گا۔“

56 ”کھانا کہاں کھانا پسند کرتی ہوں؟“
”میں کھانے کی زیادہ شوقین نہیں ہوں۔ گھر میں جو کچا ہو کھا لیتی ہوں اور کہیں جا کر کھانا تو پھر ضرور دل چاہتا ہے کہ باربی کیوں ٹونا نیٹ میں کھانا کھاؤں۔“
57 ”شاپنگ کے لیے مخصوص جگہ؟“
”کوئی نہیں ہے۔ جہاں سے اچھی چیزیں مل جائیں۔ لیکن جب زیادہ گھوم پھر کر شاپنگ کرنے کو دل نہ چاہے تو پھر پارک ٹاور اور فورم چلی جاتی ہوں۔“
58 ”کسی سے پہلی بار ملوں تو بے ساختہ کیا کہتی ہوں؟“

”اسلام علیکم۔۔۔ کیا حال ہیں جی۔“
59 ”بہت پیار کرتی ہوں؟“
”امی، صنم اور اپنے بھانجے سے۔“

60 ”پسندیدہ چینل پر پسندیدہ موسم؟“
”سب اچھے ہیں۔ مگر ڈرامے شوق سے دیکھتی ہوں اور وہ چینل جس میں صنم کے پروگرام ہو رہے ہوں۔ اور موسم تو بہار اور بارش کا پسند ہے۔“

☆ ☆

ضرور دیتی ہوں۔“
46 ”دنیا گھومنا چاہتی ہوں؟“
”صنم کے ساتھ اور اپنی امی کے ساتھ پوری دنیا گھومنا چاہتی ہوں۔ دیکھیں کہ یہ خواہش کب پوری ہوتی ہے۔“
47 ”میری نظر میں دنیا کی خوش قسمت ترین شخصیات؟“

”فرست لمبی ہے۔ لیکن اگر شوہر کی بات کریں بلکہ فلموں کی بات کریں تو مجھے امیتابھ بچن اور شاہ رخ خان کی قسمت پر رشک آتا ہے کیونکہ سنا ہے کہ انہوں نے کسی کی سپورٹ کے بغیر سب کامیابیاں حاصل کی ہیں۔“
48 ”اپنی غلطی کا اعتراف کرتی ہوں؟“
”بالکل کرتی ہوں۔ کوئی شرم محسوس نہیں کرتی۔“

49 ”میری دیرینہ خواہش؟“
”کہ میرا اپنا گھر ہو جو میں اپنے ذاتی پیسوں سے بناؤں اور خوب سجاؤں۔“
50 ”کن چیزوں کو لیے بغیر گھر سے نہیں نکلتی؟“
”اے بی ایم کارڈ اور سیل فون۔“
51 ”کن الفاظ کا استعمال زیادہ کرتی ہوں؟“
”ارے واہ Seriously اور بھی بے ساختہ بہت کچھ بول جاتی ہوں۔“

52 ”دنوں اور مہینوں میں کیا پسند ہے؟“
”دنوں میں اتوار اور پیر۔ اس لحاظ سے کہ اتوار چھٹی ہوتی ہے۔ فیملی کے ساتھ وقت گزار کر اچھا لگتا ہے اور پیر اس لیے کہ نیا دن ہوتا ہے نئی امیدیں اور نیا کام





آواز کی دُنیا

عاطف ظہر

مناہن رشید

* ”جناب میں ریڈیو کراچی ایف ایم 96 سے وابستہ ہوں اور مارننگ شو کرتا ہوں۔ صبح 7 بجے سے 10 بجے تک اور ریڈیو کے علاوہ میں جیو سپر سے وابستہ ہوں۔ کمرشل وائس اور بھی کرتا ہوں اور ڈراموں کی ڈبنگ بھی کرتا ہوں۔ اور ریڈیو اور جیو سپر سے کرکٹ کی کمنٹری بھی کرتا ہوں اور نہ صرف ڈومیسٹک بلکہ انٹرنیشنل میچیز کی بھی کمنٹری کرتا ہوں۔“

★ ”گویا... چند دن بعد شروع ہونے والے کرکٹ ورلڈ کپ کی کمنٹری بھی آپ کریں گے۔ تو کہاں سے کریں گے ریڈیو سے یا ٹی وی سے؟“

* ”جہاں سے موقع مل گیا۔ ویسے ریڈیو سے ہی کروں گا کیونکہ میرا زیادہ تعلق ریڈیو سے ہی ہے۔ اور میں نے زیادہ تر کمنٹری ریڈیو سے ہی کی ہے۔“

★ ”ورلڈ کپ کے میچز ہوں یا کرکٹ کا کوئی ٹورنامنٹ، لائنٹ چلی جائے تو لوگ ریڈیو کی طرف ہی لپکتے ہیں مگر جہاں چھکا اور چوکا لگتا ہے آپ کے ریڈیو سے استہار شروع ہو جاتے ہیں۔ بہت کوفت ہوتی ہے؟“

ریڈیو، آر جے کو اچھی سیلری نہیں دیتا لیکن شہرت ضرور دیتا ہے اور ریڈیو کے آر جے اس شوق میں آتے بھی نہیں کہ انہیں پیسہ ملے گا بلکہ وہ اپنے شوق اور جنوں کی خاطر آتے ہیں، ورنہ اگر پیسہ ہی سب کچھ ہوتا تو آج ریڈیو اسٹیشن ویران پڑے ہوئے ہوتے۔ آج ریڈیو پہ جتنے بھی آر جے کام کر رہے ہیں وہ صرف اور صرف اپنے شوق کی خاطر۔ اس لیے وہ اس شوق کے ساتھ ساتھ اپنی جاب پر بھی توجہ دیتے ہیں کہ اصل کمائی ان کی جاب ہی ہوتی ہے۔

آج ہم آپ کی ملاقات خوب صورت آواز کے مالک عاطف مظہر صاحب سے کروائیں گے عاطف مظہر ایک اسپورٹس چینل سے بھی وابستہ ہیں اور کرکٹ کمنٹری بھی کرتے ہیں۔

★ ”جی عاطف صاحب کیسے ہیں آپ؟“

* ”اللہ کا کرم ہے۔“

★ ”آج کل کیا مصروفیات ہیں۔ اور ریڈیو کے علاوہ کیا کیا کرتے ہیں؟“

ناکام ہونے کے بعد فائنلی انہوں نے کہا کہ اس لڑکے کو چانس دینا چاہیے۔ اور بس جب چانس مل گیا تو پھر میں نے پیچھے پلٹ کر نہیں دیکھا اور میرے کام کی شروعات FM-101 سے ہوئی ایف ایم 100 میں تو بعد میں آیا۔ بے شک پہلا پمپل FM100 تھا۔ FM100 جو اسن کرنے سے پہلے میں دہی چلا گیا تھا اور دہی کے ریڈیو سے میں نے تقریباً 3 سال کام کیا اور جب دہی سے واپس آیا تو میں نے FM100 کو جو اسن کیا۔

★ ”دہی سے کیسے آفر آئی؟“

★ ”میں نے تقریباً 4 ماہ ایف ایم 101 سے کام کیا اور دہی ریڈیو والوں نے میرا پروگرام سن کر مجھے آفر دی انہیں میری آواز اور میرا انداز اچھا لگا۔ انہوں نے میری پروفائل مانگی، کچھ پروگراموں کی ریکارڈنگز مانگیں اور پھر ایروول کے بعد میرا ویزا آگیا۔ اور وہاں ایف ایم 106.2 میں اور جب واپس آیا تو بہ حیثیت کریٹوئیٹر کے ایف ایم 100 جو اسن کیا اور ساتھ ساتھ شہر بھی کیے۔“

★ ”دہی سے واپسی کچھ گھریلو پراہلن کی وجہ سے ہوئی۔ مگر دہی والوں نے روکا تو ہو گا؟ کیونکہ وہاں کا ماحول اور قوانین بہت اعلیٰ ہیں؟“

★ ”بالکل ٹھیک کہہ رہی ہیں آپ۔ انہوں نے بہت کہا، مگر میں رک نہیں سکتا تھا کیونکہ میری والدہ کی طبیعت ٹھیک نہیں تھی۔ اور میں افسوس اس لیے نہیں کرتا کہ جو ہوتا ہے اچھے کے لیے ہی ہوتا اور الحمد للہ میں بہت خوش ہوں جہاں پہ بھی ہوں۔ لیکن اگر دوبارہ آفر آئی تو ضرور جاؤں گا۔“

★ ”ریڈیو پاکستان سرکاری ادارہ ہے۔ پیسوں کے معاملے میں انتہائی کنجوس۔ تو آپ کو بھی کم ہی ملتے ہوں گے؟“

★ ”جی ہاں۔ پیسے تو بہت ہی کم ملتے تھے، بہ مشکل ایک پروگرام کے 75 روپے ملا کرتے تھے اور شوق کا اندازہ آپ اس بات سے کریں کہ اس زمانے میں نہ ہمارے پاس بایک تھی نہ کار ہوتی تھی، صبح 5 بجے

★ ”ہاں جی، یہ تو ہے اور صرف کمینٹری ہی تو نہیں سنوائی ہوتی، کمنا بھی تو ہوتا ہے اور یہی موقع ہوتا ہے کمانے کا۔ لوگ کوفت کا شکار بھی ہوتے ہیں اور شکایتیں بھی کرتے ہیں مگر کیا کریں کہ یہ مجبوری ہے اور میں سمجھتا ہوں کہ ریڈیو وی سے زیادہ اسٹوڈنٹ میڈیا ہے اور اب تو اور بھی زیادہ ہو گیا ہے جب سے کاروں میں اور موبائل میں ریڈیو آگیا ہے اور جب سے F.M. چینلز کھل گئے ہیں آپ یقین کریں کہ صبح کا مارننگ شو خواتین بچن میں ریڈیو رکھ کر شوق سے سن رہی ہوتی ہیں اور پراٹھے بھی پکارتی ہوتی ہیں۔“

★ ”اچھا۔ پھر تو آپ خواتین کے پسندیدہ آر جے ہوں گے اور آپ کا بھی دل چاہتا ہو گا صبح پراٹھے کھانے کو؟“

★ ”بالکل۔۔۔ جی پسندیدہ ہیں ہم خواتین کے۔ ہاں دل تو چاہتا ہے پراٹھے کھانے کو، مگر میں آج کل ڈائیٹ پہ ہوں۔ حالانکہ میں اپنی ہائیٹ کے حساب سے نارل ویٹ رکھتا ہوں مگر پھر بھی۔ اور میری ہائیٹ ماسٹا اللہ سے ساڑھے چھ فٹ ہے۔“

★ ”پھر تو بیگم بھی لمبی ہوں گی؟“

★ ”نہیں وہ شاید 5 فٹ یا 5.4 فٹ ہوں گی اور میری بیگم بھی ریڈیو سے وابستہ ہیں پہلے ان کا نام نزہت حسین نام تھا اب نزہت عاطف ہیں اور وہ میرے شو کے بعد شو کرتی ہیں۔“

★ ”ریڈیو پہ آمد کیسے ہوئی، کیا کشش لے کر آئی آپ کو اس فیلڈ میں؟“

★ ”میں 1999ء سے ریڈیو سے وابستہ ہوں۔ اس زمانے میں میں طالب علم تھا اور ریڈیو بڑے شوق سے سنتا تھا۔ اس زمانے میں ہی FM-100 کی نشریات شروع ہوئی تھیں تو ایک دو آر جے کو سن کر لگا کہ یہ تو بڑا زبردست کام ہے۔ اور ہمیں بھی کرنا چاہیے، پہلے گھر میں بولنے کی پریکٹس کی، پھر آڈیشن کے لیے گئے۔ سلیکشن نہیں ہوا، پھر دوبارہ گئے۔ پھر سلیکٹ نہیں ہوئے۔ پھر محنت کی اور چار، پانچ دفعہ



بیسک چیزیں تو آتی ہی نہیں ہیں۔ تو وہاں میں نے پروڈکشن سیکھی اسکرپٹ رائٹنگ شروع کی کمرشلز کے بارے میں سیکھا، وائس اور کس طرح کرتے ہیں۔ اصل میں جو کچھ سیکھا وہ وہی ریڈیو سے سیکھا۔“

★ ”آپ نے 1999ء میں ریڈیو جوائن کیا۔ اب 2015ء ہے اتنے سالوں میں آپ نے کیا چیخ و دیکھا ایف ایم میں انداز بد لایا اسی پٹرین پہ چل رہا ہے سب کچھ؟“

★ ”جب ہم نے شروع کیا تھا تو اس وقت ریڈیو انڈسٹری نہیں تھا آج ریڈیو پوری انڈسٹری ہے اس وقت تقریباً 14-15 ریڈیو اسٹیشن تو صرف کراچی میں ہی ہیں۔ اور پورے ملک میں تو نہ جانے کتنے ہی ہوں گے جہاں تک چیخ کی بات ہے تو پہلے زمانے میں امیجورٹی زیادہ تھی۔ بچکانہ پن زیادہ تھا۔ اب میچورٹی آگئی ہے۔ لائیو کالز لیتے ہیں، فوری فوری رسپانس آتا ہے لوگوں کا۔ اور انفارمیشن بتانے میں۔ تو بانی تو سب کچھ وہی ہے۔“

★ ”آج کل کے نوجوان آر جے کے بارے میں آپ کیا کہیں گے؟“

★ ”آج کل تو سین یہ ہے کہ ہر پتھر کے نیچے آپ کو ایک آر جے نظر آئے گا ہمارے زمانے میں ایسا نہیں تھا۔ صرف بارہ تیرہ آوازیں تھیں جنہیں لوگ جانتے

اپنے گھر سے نکلتے تھے، بس میں بیٹھتے تھے، گرو مندر آتے تھے۔ ایک ڈیڑھ گھنٹے کا سفر کر کے ریڈیو پاکستان پہنچتے تھے، شو سے ایک گھنٹہ پہلے پہنچ جاتا تھا اور پھر پروگرام۔۔۔ تو کریر تھا، جنون تھا اور دلچسپ بات تو یہ کہ جب میں دہلی سے پہلی بار واپس آیا تو پاکستان میں آکر نہ کسی کو سلام دعا کیا نہ حال احوال پوچھا، سیدھا رخ ریڈیو پاکستان کی طرف کیا۔ اتنا پاگل تھا ریڈیو کے معاملے میں۔“

★ ”گھروالوں نے نہیں کہا کہ اس میں تو کمائی بھی نہیں ہے نہ ہی اسکوپ کیوں زندگی برباد کر رہے ہو؟“

★ ”نہیں۔۔۔ ایسا کچھ نہیں کہا، بلکہ میری امی نے مجھے بہت سپورٹ کیا، کیونکہ وہ بھی اپنے اسکول کی غیر نصابی سرگرمیوں میں بہت ایکٹو رہتی تھیں، تو انہوں نے میری بہت حوصلہ افزائی کی اور کہا کہ بیٹا اپنا شوق پورا کرو مگر اپنی پڑھائی سے غافل مت ہونا اور یہ میری خوش قسمتی ہے کہ کافی چھوٹی عمر سے میں نے کافی زیادہ کماتا شروع کر دیا 2000ء میں دہلی گیا اور تین ساڑھے تین ہزار درہم ملتے تھے تو خود سوچیں کہ پاکستانی کتنے ہوتے ہوں گے۔ 2000ء میں میری عمر چھی 21، 20 سال تھی اور اتنی عمر میں زیادہ کمائی کا عمل شروع ہو جائے تو پھر پڑھائی میں کہاں دل لگتا ہے۔ مگر میں نے پھر بھی کمپیوٹر سائنس میں ماسٹرز کیا۔“

★ ”اچھا رسپانس ملے تو مزید کچھ کرنے کو دل چاہتا ہے۔ تو ایسا ہوا؟“

★ ”جی بہت رسپانس ملا اور اس کے لیے میں اپنے رب کا جتنا بھی شکر کروں کم ہے۔ اور حد تو یہ ہے کہ جب ہم روڈ شو میں جاتے تھے تو لڑکیوں کو اس حد تک میں نے دیوانہ دیکھا کہ وہ میری شرٹس پکڑ رہی ہیں، چھوٹا ان کے لیے اعزاز ہوتا تھا کہ بتائیں عاطف مظہر کیا چیز ہے۔ دہلی میں بھی لوگ پسند کرتے تھے مگر پاکستان جیسا کراؤ میں نے نہیں دیکھا مگر سچ بتاؤں کہ ریڈیو کو جو میں نے سمجھا وہ وہی ریڈیو میں۔ وہاں انڈین اشارز بھی تھے پاکستانی اشارز بھی تھے ان کے ساتھ جب میں نے کام شروع کیا تو مجھے اندازہ ہوا کہ مجھے

* ”شہرت کس کو بری لگتی ہے۔۔۔ اگر آپ کو دوس لوگ جانتے ہیں اور آپ کا عزت سے نام لیتے ہیں تو یہ بات کس کو بری لگے گی تو اس لحاظ سے مجھے بھی شہرت اچھی لگتی ہے۔“

★ ”Wake up“ کراچی آپ کے پروگرام کا نام ہے گویا سوئے ہوئے لوگوں کو جگاتے ہیں؟“

* ”بالکل جی۔۔۔ سوئے ہوئے لوگوں کو جگاتا ہوں اور لائیو کالز بھی لیتا ہوں اور ہر طرح کے لوگ یعنی ہر عمر کے لوگ ہمیں کال کر رہے ہوتے ہیں اور سب محبت کرنے والے لوگ ہوتے ہیں۔ کچھ تیز طرار اور چلبیلے نوجوان بھی ہوتے ہیں ان سے بات کرنے کا اپنا ہی مزہ ہوتا ہے۔ وہ بد تمیزی نہیں کرتے۔“

★ ”ٹکس طرح اندازہ ہوتا ہے کہ لوگ آپ کے پروگراموں کو اور آواز کو پسند کرتے ہیں؟“

* ”میں آپ کو ایک واقعہ بتاؤں۔ ایک بار میں نیکی میں تھا اور ڈرائیور مجھ سے اپنی باتیں کر رہا تھا تو میں نے بھی اسے بتایا کہ میں ریڈیو پر کام کرتا ہوں تو بے ساختہ بولا ”او تم ریڈیو پر کام کرتا ہے۔ ہم کو عاطف مظہر سے ملنا ہے ہم اس کا بہت بڑا فین ہیں“ اور وہ پورے راستے عاطف مظہر ہی کرتا رہا۔۔۔ اور میں سنتا رہا۔۔۔ اور جب میں نیکی سے اترنے لگا تو میں نے اسے بتایا کہ ”مجھے ہی عاطف مظہر کہتے ہیں“ تو آپ یقین کریں کہ اس کی خوشی دیکھنے کے قابل تھی وہ اتر کر مجھ سے گلے ملا اور اس نے مجھ سے کرایہ بھی نہیں لیا اور اپنا فون نمبر دیا اور کہا کہ میں آپ کے لیے چوبیس گھنٹے حاضر ہوں آپ نے جہاں جانا ہو مجھے کال کر دیا کریں اور کچھ ایسے فہنز بھی ہیں جو میں دینی گیا تو وہ مجھے دینی کال کرتے تھے بات کرنے کے لیے۔“

★ ”گھر میں سب سے زیادہ کون آپ کے پروگرام کو پسند کرتا ہے؟“

* ”سب ہی کرتے ہیں، مگر میری ماں میری بہت بڑی فین تھیں۔ جب وہ حیات تھیں تو بڑی باقاعدگی

تھے انہیں پسند کرتے تھے اور ان کے بارے میں ہر بات جانتا چاہتے تھے۔ ان کے انٹرویوز آتے تھے تو بڑے شوق سے لوگ خریدتے تھے اور پڑھتے تھے آج کل ایسا نہیں ہے۔۔۔ اب صرف ریڈیو اسٹیشن نہیں ہے اب ویب ریڈیو بھی کھل گئے ہیں تو ہر کوئی اپنے آپ کو آر جے کہہ رہا ہوتا ہے اور جب کو انٹرویو آ جاتی ہے۔ تو کوالٹی کم ہو جاتی ہے اس لیے آپ کو اچھے آر جے بہت کم ملیں گے آج کے نوجوان آر جے سے میں تو مطمئن نہیں ہوں اور جو مجھ سے گائیڈنس مانگتا ہے اس کو میں ضرور گائیڈ کرتا ہوں۔“

★ ”آر جے میں کن خوبیوں کا ہونا ضروری ہے؟“

* ”سب سے بنیادی خوبی تو آپ کی آواز ہے کیونکہ یہ کہلاتی ہے آواز کی دنیا۔ آپ کے الفاظ کا چناؤ، اس کا اتار چڑھاؤ، کس طرح سے گانوں کو پہلے کرنا چاہیے کونسا گانا کب چلانا چاہیے اور اس سے پہلے کیا بات کرنی چاہیے۔ کالر سے کس طرح بات کرنی ہے۔۔۔ پھر یہ کہ انہیں عزت دینی چاہیے، آج کل تو تم اور آپ کے الفاظ کم اور تو تڑاک زیادہ ہونے لگا ہے۔ ہم میں تو ہمت نہیں ہوتی کہ اپنے کسی کالر سے تم یا تو کر کے بات کریں۔ پہلے ریڈیو کو فیملی ریڈیو سمجھا جاتا تھا جبکہ آج ایسا نہیں ہے۔“

★ ”ریڈیو پر کام کرنے والے ہمارے حساب سے آل راؤنڈر ہوتے ہیں ہر کام کر رہے ہوتے ہیں۔۔۔ نی وی پی بھی۔۔۔ تو آپ آئی وی پی پر؟“

* ”میں نی وی پی پر بھی کام کرتا ہوں۔ اسکرین پر آیا ہوں، جیو سپر کے پروگراموں میں ہمارا ایک پروگرام ہوتا تھا ”سیر آئی“ لائیو شو ہوتا تھا اور تمام بڑے سپر کھلاڑیوں کے ساتھ میں نے پروگرام کیے ہیں اور میرے انٹرویوز بھی ہوتے ہیں۔ مثلاً ”سی این بی سی پاکستان“ ”جاگ لی وی“ یہ ہوا خود میں نے بھی اینکونگ کی ہے اسپورٹس کے حوالے سے۔“

★ ”لوگ جانتے پہچانتے ہیں تو کیا محسوس کرتے ہیں؟“

MEDICAM

Bleach Cream

Whiteness
in 14 days

*No Side Effects



زمے دیر نظر آپ پر!

سے میرے شوز سنتی تھیں۔ میری حوصلہ افزائی کرتی تھیں انہی پسند کے گانے لگواتی تھیں۔ تو مجھے بھی بہت خوشی ہوتی تھی۔ اور موڈ کا اثر ہمارے پروگراموں پر ضرور ہوتا ہے۔“

مجھے کہتی ہے کہ میں ہر رشتے میں اچھا ہوں۔ ماں کے ساتھ بھی، بہنوں کے ساتھ اور شوہر تو میں ہوں ہی اچھا۔۔۔ قہقہہ۔۔۔ اور مجھے یقین ہے کہ جب اللہ تعالیٰ مجھے اولاد کی نعمت سے نوازے گا تو میں باپ بھی بہت اچھا ہوں گا اور میں غلط کو غلط کہتا ہوں۔ مگر غصہ نہیں کرتا۔ میرا ٹپرا منٹ بہت اچھا ہے ہاں جب نوجوان تھا تو اس وقت میرا ٹپرا منٹ بہت تیز تھا۔ مگر اب سب سب ہے۔“

واشنگ مشین کے لئے

سویاں

صوفی سوپ

اچلی دھلائی کی سچی طاقت



مقدس رباب

ادارہ

- ★ ”آپ اپنے گزرے کل، آج اور آنے والے کل کو ایک لفظ میں کیسے واضح کریں گی؟“
- ✽ ”اپنے رب پہ توکل اور اچھی امید!“
- ★ ”اپنے آپ کو بیان کریں؟“
- ✽ ”حد سے زیادہ صاف گو، نرم دل اور حساس۔“
- ★ ”کوئی ایسا ڈر جس نے آج بھی اپنے بچے آپ میں گاہے ہوئے ہیں؟“
- ✽ ”جب ملٹری ہسپتال کراچی میں میرے بیٹے کا آپریشن ہوا تھا۔ اپنوں سے دور رہ کر میں نے وہ دن اذیت میں گزارے تھے آج وہ دن خوفزدہ کر دیتے ہیں۔“
- ★ ”آپ کی کمزوری اور طاقت کیا ہے؟“
- ✽ ”میری فیملی میری کمزوری اور طاقت میرا بھائی۔“
- ★ ”آپ خوش گوار لمحات کیسے گزارتی ہیں؟“
- ✽ ”بہت زیادہ خوش ہو کر اور بچوں کی پسند کی ڈشز بنانا کر۔“
- ★ ”آپ کے نزدیک دولت کی اہمیت؟“
- ✽ ”رب اللہ تعالیٰ کی ایسی آزمائش جس پر پورا اترنا ہر انسان کے بس کی بات نہیں ہے۔“
- ★ ”گھر آپ کی نظر میں؟“
- ✽ ”عورت کا حسین خواب اور ایسی پناہ گاہ جو اس دنیا کی غلیظ نظروں سے محفوظ رکھتی ہے۔“
- ★ ”کیا آپ بھول جاتی ہیں اور معاف کر دیتی ہیں؟“
- ✽ ”معاف کر دیتی ہوں کہ یہ سنت نبی صلی اللہ علیہ وسلم ہے۔ البتہ اس انسان سے دوبارہ ملنا ملنا میرے لیے دشوار ہو جاتا ہے۔ یعنی بھولتی نہیں ہوں۔“
- ★ ”اپنی کامیابیوں میں کسے حصہ دار ٹھہراتی ہیں؟“
- ✽ ”ماں کی دعا میں اور رحمت خداوندی۔“
- ★ ”سائنسی ترقی نے ہمیں مشینوں کا محتاج کر کے کاہل کر دیا یا واقعی یہ ترقی ہے؟“
- ✽ ”مشینوں نے ایک دم کاہل اور ست کر دیا ہے۔ اسی لیے آج کا ہر دوسرا انسان ڈیپریشن کا شکار ہے۔“
- ★ ”کوئی عجیب خواہش؟“
- ✽ ”کہ ہمارا بیارا ملک علامہ اقبال کے خواب جیسا

- ★ ”آپ کا پورا نام، گھر والے پیار سے کیا پکارتے ہیں؟“
- ✽ ”مقدس رباب اور اکثر رباب نام کی ہی پکار پڑتی ہے۔“
- ★ ”کبھی آئینے نے آپ سے یا آپ نے آئینے سے کچھ کہا؟“
- ✽ ”جب بھی آئینہ دیکھتی ہوں تو اس ذات باری تعالیٰ کا شکر ادا کرتی ہوں کہ اس نے کسی چیز کی کمی نہیں رکھی۔“
- ★ ”آپ کی سب سے قیمتی ملکیت؟“
- ✽ ”میری فیملی اور میرے دوست یعنی کہ ڈائجسٹ۔“
- ★ ”آپ اپنی زندگی کے دشوار لمحات بیان کریں؟“
- ✽ ”جب میرے والد صاحب کا انتقال ہوا۔ وہ لمحے آج بھی سوچوں تو اذیت حد سے سوا ہو جاتی ہے۔“
- ★ ”آپ کے لیے محبت کیا ہے؟“
- ✽ ”ایک ایسا آفاقی جذبہ جو آپ کو انسانیت جیسے بلند رتبے پہ فائز کرتی ہے زندگی محبت کے بغیر ادھوری ہے۔ محبت ہر رشتے کو جوڑے رکھتی ہے۔“
- ★ ”مستقبل قریب کا کوئی منصوبہ جس پر عمل کرنا آپ کی ترجیح میں شامل ہو؟“
- ✽ ”حج کی سعادت حاصل کروں اور بہت عرصے سے ایک خواہش ہے کہ کرپلا کی سرزمین دیکھوں جہاں پر حسین ابن حیدر نے سجدہ شکر ادا کیا۔“
- ★ ”پچھلے سال کی کوئی کامیابی جس نے آپ کو مسرور و مطمئن کیا ہو؟“
- ✽ ”میرے بچوں کی ہر کامیابی میرے لیے خوشی کا باعث ہوتی ہے۔ اور کرن میں اپنا نام دیکھ کر جو خوشی ملی وہ بیان سے باہر ہے۔“

ہو جائے قائد اعظم اور خان لیاقت علی خان جیسے عظیم حکمران ایک بار پھر ہمارا مقدر بن جائیں (آمین)۔

★ ”برکھارت کیسے انجوائے کرتی ہیں؟“

★ ”خواب ہوئے وہ دن جب ہم بھی برکھارت انجوائے کرتے تھے اب تو یہ شوق بچوں میں منتقل ہو گیا ہے۔“

★ ”آپ جو ہیں وہ نہ ہوتی تو کیا ہوتیں؟“

★ ”میں اب بھی کرن کی قاری ہوں اور تب بھی کرن کی قاری ہی ہوتی ہاں۔“

★ ”آپ بہت اچھا محسوس کرتی ہیں سب؟“

★ ”بہت توجہ اور دھیان سے اپنے رب کی عبادت کرتی ہوں یوں محسوس ہوتا ہے کہ میرا لپٹن ہار مجھے دیکھ بھی رہا ہے اور سن بھی رہا ہے۔“

★ ”آپ کو کیا چیز متاثر کرتی ہے؟“

★ ”اچھا رویہ، خلوص اور بچوں کی مسکراہٹ۔“

★ ”کیا آپ نے اپنی زندگی میں وہ سب پالیا ہے جو آپ پانا چاہتی تھیں؟“

★ ”جے شک میرے مالک نے میری اوقات سے بڑھ کر نوازا ہے۔ شکر ہے اس پاک ذات کا میں کیا اور میری اوقات کیا۔“

★ ”آپ کی ایک خوبی یا خامی جو آپ کو مطمئن یا مایوس کرتی ہے؟“

★ ”خوبی یہ ہے کہ میں بہت جلد معاف کر دیتی ہوں اور خامی یہ ہے کہ اکثر مجھ سے نماز قضا ہو جاتی ہے۔ یقیناً یہ بہت بڑی خامی ہے۔“

★ ”کوئی ایسا واقعہ جو آج بھی آپ کو شرمندہ کر دیتا ہو؟“

★ ”الحمد للہ ایسا کوئی واقعہ نہیں ہے۔“

★ ”کیا آپ مقابلے کو انجوائے کرتی ہیں یا خوف زدہ ہو جاتی ہیں؟“

★ ”اللہ پر چھوڑ دیتی ہوں۔ کیونکہ قسمت میں جو لکھا ہے ہوتا تو وہی ہے۔“

★ ”متاثر کن کتاب مصنف ’مووی‘؟“

★ ”قرآن پاک جو سب کتابوں سے افضل بھی ہے اور مکمل ضابطہ حیات بھی ہے۔ نگہت عبداللہ اور

مووی دیکھتی ہی نہیں۔“

★ ”آپ کا غرور؟“

★ ”غرور تو صرف رب کائنات کو ہی چلتا ہے۔ البتہ مجھے اپنے باپ جیسے شفیق بھائی پر ناز ہے۔ جس نے ہم بہنوں سے چھوٹا ہونے کے باوجود باپ جیسے شفقت بھی دی اور بھائیوں سامان بھی۔ سدا خوش رہو میرے بھائی آمین۔“

★ ”کوئی ایسی شکست جو آج بھی آپ کو رلاتی ہے؟“

★ ”بہت چھوٹی سی بات بھی اکثر رلا دیتی ہے۔ لیکن کبھی کبھی یہ شکست آگے بڑھنے کا حوصلہ بھی تو دیتی ہے۔ اس لیے وقتی شکست پر مایوس نہیں ہوتا چاہیے۔“

★ ”کوئی شخصیت یا کسی کی حاصل کی ہوئی کامیابی جس نے آپ کو حسد میں مبتلا کیا ہو؟“

★ ”کرن کی ہر اچھی تبصرہ نگار پر رشک آتا ہے۔ جیسے فوزیہ شمر، انیقہ انا اور کئی دوسری بس دل میں خواہش ہوتی ہے کہ کاش ان میں میرا نام بھی شامل ہو جائے۔ اسے آپ حسد نہیں کہہ سکتے۔ ہاں۔“

★ ”مطالعہ کی اہمیت آپ کی زندگی میں؟“

★ ”جس طرح انسان کو زندہ رہنے کے لیے ہوا اور پانی کی ضرورت ہوتی ہے اسی طرح روح کی کتھارس کے لیے ایک اچھی کتاب کا مطالعہ بے حد ضروری ہے۔“

★ ”آپ کی پسندیدہ شخصیت؟“

★ ”شرم و حیا کا پیکر ثانی زہرا حضرت بی بی زہراؓ۔“

★ ”ہمارا پیارا ملک سارا کا سارا خوب صورت ہے آپ کا کوئی خاص پسندیدہ مقام؟“

★ ”کراچی میں صرف ایک سال میں نے قیام کیا تھا اور اتنی خوب صورت یادیں سمیٹی ہیں کہ بتا نہیں سکتی۔ خدا جانے وہ کون لوگ ہیں۔ جو اس شہر کی روشنیاں گل کر کے اسے اندھیروں میں دھکیلنا چاہتے ہیں۔ خدا سے دعا گو ہوں کہ خدا ایسے دشمنوں کو غارت کرے اور اس پیارے شہر کو پھر سے روشنیوں کا گہوارہ بنادے۔ آمین۔“

نقیسہ سعید

اگسا کر ہے زندگی

ملک صاحب اپنے گھر والوں کو بے خبر رکھ کر اپنے کم سن بیٹے ایشال کا نکاح کر دیتے ہیں، جبکہ ایشال کی دلچسپی اپنی کزن عریشہ میں ہے۔
حبیبہ تعلیم حاصل کرنے کے لیے حیدر آباد سے کراچی آئی ہے۔ شاہ زین کے والد نے اسے اپنے آفس میں اپائنہ کر لیا
شاہ زین حبیبہ میں دلچسپی لینے لگا۔
فرہاد تین بھائی ہیں۔ فرہاد کے دونوں بھائی معاشی طور پر مستحکم ہیں اور دونوں اپنی بیوی بچوں کی ضروریات کو دل کھول کر پورا کرتے ہیں جبکہ فرہاد اپنی بیوی زینب اور بچوں کی ضروریات پوری کرنے میں بے حد کجوسی سے کام لیتا ہے جو زینب کو بالکل پسند نہیں۔
فرہاد کے بڑے بھائی کی بیوی فضلہ زینب کی خوب صورتی سے حسد کرتی ہیں اور آئے دن اس حسد کا اظہار کرتی رہتی ہیں۔
(اب آگے پڑھیے)

اصطوین قیصر





”میری بات کا جواب دو زینب۔“

کچھ دیر انتظار کے بعد سالار نے اسے ایک بار پھر سے پکارا، چائے میں چچہ چلاتے زینب یک دم چونک اٹھی اپنی جھکی جھکی نظریں اٹھا کر اسے نکال کر اسے اپنی بات کے جواب کا انتظار لیے بے چینی سے اس کی جانب متوجہ تھا۔
”میں تم سے محبت کرتا ہوں زینب بے حد محبت، ایسی بے اختیار محبت جس پر اب شاید مجھے خود بھی اختیار نہیں رہا اور شاید اس محبت میں میں اس دن ہی گرفتار ہو گیا تھا جس دن میں نے تمہیں پہلی بار دیکھا تھا اور یہ جانتے ہوئے بھی کہ تم ایک شادی شدہ عورت ہو میں خود کو نہ روک پایا اور یہ بات تم بہت اچھی طرح جانتی ہو۔“
اک دم وہ بات کرتے کرتے سانس لینے کے لیے رکا زینب نے بغور اس کے چہرے کی جانب نظر ڈالی اک انجانا کرب سا اس کے چہرے پر دکھائی دے رہا تھا۔

”اور میں یہ بھی جانتا ہوں زینب کہ تم بھی مجھے پسند کرتی ہو۔“
ایں دونوں کمنیاں ٹیبل پر ٹکائے آگے کی جانب جھکا زینب کو محسوس ہوا شاید وہ اس کے لیے لفظ ”محبت“ استعمال کرتے ہوئے جھک سا گیا ہے۔

”ہاں یہ سچ ہے کہ میں آپ کو بے حد پسند کرتی ہوں مگر اس کا مطلب نہیں جو آپ سمجھ بیٹھے ہیں۔“
وہ جب بولی تو اسے اپنا لہجہ خود بھی سچ سے عاری محسوس ہوا۔

”واٹ“ سالار کو جیسے کرنا لگا۔

”میں تمہاری بات سمجھا نہیں۔“

حیرت اس کے لہجہ میں در آئی۔

”سالار آپ میرے ایک بہت اچھے دوست ہیں ایک ایسے قابل اعتبار دوست جس پر شاید اس دنیا میں سب سے زیادہ بھروسہ اور اعتماد کر سکتی ہوں مگر اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ میں فرہاد اور اپنی بچیوں کو چھوڑ کر آپ سے شادی کر لوں پتا نہیں آپ نے ایسا سوچا بھی کس طرح مجھے تو اس بات پر حیرت ہے۔“

وہ خود پر کافی حد تک قابو پا چکی تھی جس کا اندازہ اس کے لہجہ کی خود اعتمادی کو دیکھ کر بخوبی لگایا جاسکتا تھا۔
”تم غلط کہہ رہی ہو زینب عورت اور مرد کبھی دوست نہیں ہو سکتے شاید میرے نزدیک ایسی دوستی کوئی معنی نہیں رکھتی اور ویسے بھی ہمارے اس معاشرے میں ایسی دوستی عزت کی نگاہ سے نہیں دیکھی جاتی اور یہ ہی وہ سبب ہے جس کے باعث میں تمہیں عزت دینے کی کوشش کر رہا ہوں مگر تم جانے کیوں یہ سب کھلے دل سے قبول کرتے ہوئے گھبرا رہی ہو۔“

وہ آج ہر بات واضح کر دینا چاہتا تھا پھر جانے زندگی میں ایسا موقع ملے نہ ملے کیونکہ اسے تقریباً ایک ہفتہ تک تازیہ کے ساتھ ابرو ڈچلے جانا تھا۔

”میرا خیال ہے کہ اب مجھے چلنا چاہیے مریم کی چھٹی کا ٹائم ہونے والا ہے۔“

سالار کی کسی بھی بات کا جواب اس کے پاس نہ تھا۔
”یاد رکھو زینب قسمت ہر انسان کو اس کی زندگی بدلنے کا ایک موقع ضرور دیتی ہے جو آج تمہیں بھی مل رہا ہے مگر تم شاید اپنے در پر دستک دینے والی اس خوش قسمتی کو دنیا کے خوف سے ٹھکرا رہی ہو ایسی بھی سوچ لو وقت ہے ایسا نہ ہو کل کو تمہیں پچھتانا پڑے۔“

سالار نے ایک آخری کوشش اور کی۔

”میری اچھی یا بری قسمت میرے بچوں اور شوہر کے ساتھ ہے۔“

نہیں جانتی تھی کہ فرہاد کی بے اعتنائی کے باعث کسی دوسرے مرد سے کی جانے والی دوستی کے نام پر حاصل

ہرنے والی تسکین اسے آج اس مقام پر لا کھڑا کرے گی جس کے ایک طرف کھائی ہوگی اور دوسری جانب محبت کے نام پر ہمتا تیز دریا جو اپنے ساتھ سب کچھ بہا لے جانے کو تیار تھا۔ سالار کا یہ مطالبہ اس کے لیے بالکل ناقابل یقین تھا۔ اسے کبھی یہ امید نہ تھی کہ کوئی مرد اس قدر دلیر بھی ہو سکتا ہے۔ وہ تو ہمیشہ یہ ہی سمجھتی رہی کہ اس کے اور سالار کے درمیان جو ڈھکا چھپا سلسلہ چل رہا ہے، وہ ہمیشہ ایسے ہی چلتا رہے گا۔ مگر حالات نے آج جو رخ اختیار کیا وہ اس کے تصور میں بھی نہ تھا۔ مرد کی ایسی مضبوط محبت کا تصور بھی شاید اس کے نزدیک محال تھا۔ اس نے تو اپنی زندگی میں ہمیشہ فراہ جیسے مرد کو ہی دیکھا تھا۔ لاہروا بے خبر اور محبت سے قطعی عاری شخص جس کے نزدیک کسی کے ہونے یا نہ ہونے سے کوئی فرق نہ پڑتا تھا، مگر شاید سالار بھی نازیہ کے لیے فراہ جیسا ہی ایک مرد تھا۔ یہ خیال ذہن میں آتے ہی وہ بے اختیار بول اٹھی۔

”مجھے بہت افسوس ہے سالار تم نے میری محبت کے حصول کی خاطر اپنی بیاری بوی کو یکسر فراموش کر دیا، تم نے یہ کیوں نہیں سوچا کہ مجھ سے دوسری شادی کی خبر نازیہ کے لیے کسی قدر اذیت کا باعث ثابت ہوگی۔“

”اس کا ذکر مت کرو، وہ سب کچھ جانتی ہے اور وہ خود چاہتی ہے کہ میں تم سے شادی کر لوں اور یہ اس کی خواہش تھی جو آج میں تمہارے سامنے بیٹھا ہوں۔“

سالار کا جواب اس کے لیے قطعی غیر متوقع تھا۔ نازیہ سب کچھ جانتی ہے۔ اس سوچ نے ہی اسے مزید شرمندہ کر دیا۔

”میرا خیال ہے اب ہمیں چلنا چاہیے۔“ کرسی پیچھے کھسکاتی وہ یکدم اٹھ کھڑی ہوئی۔

سالار بنا کچھ کئے میز پر رکھی گاڑی کی چابی اٹھاتا اس کے قریب سے گزرتا دروازے کی جانب بڑھ گیا۔ یقیناً ”وہ ناراض ہو چکا تھا۔ جس کا اندازہ اس کے چہرے کو دیکھ کر غولی لگایا جاسکتا تھا۔ یہ سب جانتے ہوئے بھی زہن نب اسے منانے کی ہمت خود میں نہ رکھتی تھی۔ اسی لیے کئے کئے انداز میں دھیرے دھیرے قدم اٹھاتی اس کے پیچھے چل دی۔



”اماں کیا سوچ رہی ہو؟“

ماں کو کئی دیر تک خیالوں میں ڈوبا دیکھ کر وہ بے اختیار اس کا کندھا ہلکا بیٹھی۔

”آں۔۔۔ ہاں کچھ نہیں۔۔۔“

انہوں نے ایک نظر اپنے بالکل سامنے کھڑی بیٹی پر ڈالی۔ سرو قد اور خوب صورت خدو خال کی مالک اپنی عمر سے قدرے بڑی دکھائی دے رہی تھی۔

”یہ تو بالکل میری جوانی ہے ہو ہو میرے جیسی۔“ وہ یکدم ہی خوف زدہ ہو گئیں۔

”یہ اتنی بڑی ہو گئی اور مجھے آج تک پتا ہی نہ چلا۔“ اس خیال کے آتے ہی انہوں نے یکدم اک جھرجھری سی لی۔

”کیا ہوا اماں۔۔۔“ اس نے دوبارہ ماں کا کندھا ہلایا۔

”اور یہ سب کیا ہے؟“ جواب نہ پا کر ماں کے سامنے بکھرے کانغذات پر نظر ڈالتے ہوئے وہ سرا سوال کیا۔

”کچھ نہیں۔“

وہ جلدی جلدی تمام کانغذات سمیٹ کر اٹھ کھڑی ہوئیں۔

”اماں کیا ہوا تمہیں کیوں اس قدر پریشان ہو؟“

ماں کے چہرے پر چھائے تاثرات نے اسے پریشان کر دیا۔
 ”نہیں بیٹا تمہیں غلط فہمی ہوئی ہے میں بھلائیوں پریشان ہونے لگی۔“ وہ شاید خود پر قابو پا چکی تھیں۔
 ”تمہارے امتحانات کب سے شروع ہو رہے ہیں؟“
 ”شاید اگلے ماہ کی بیس تاریخ ہے۔“
 ”اچھا۔۔۔“

ماں نے ہاتھ میں تھے تمام کاغذات ایک خالی لفافے میں ڈال دیے اور پھر وہ خالی لفافہ ٹرنک کے اندر رکھ کر واپس پلٹ آئی۔

”اماں۔۔۔“
 اس نے کچھ سوچتے ہوئے ایک بار پھر ماں کو پکارا۔
 ”کیا ہوا؟“

”اماں مجھے نیائی وی لے کر دو۔“ شاید اب وہ اپنے گھر میں پھیلے سائے سے تنگ آ چکی تھی۔
 ”نی وی۔۔۔“

اماں نے زیر لب بڑبڑاتے ہوئے کچھ دور لکڑی کی نیبل پر موجود ایک کالے سے ذبے پر نظر ڈالی۔
 ”اماں اب یہ ٹھیک نہیں ہو سکتا جانے کتنا رانا ہے، مجھے تو اب نیائی وی لے کر دو جس پر کیبل بھی آتا ہو اب تو سارے ہی محلے کے لوگ کیبل پر ڈرامے اور فلمیں دیکھتے ہیں ایک سوائے ہمارے۔“
 وہ شاید اپنی ماں کا ارادہ بھانپ چکی تھی۔ اس لیے لاڈ سے بولی۔

”اچھا قاطعہ خالہ کپاس میری ایک نیلی ہے پوچھتی ہوں کب تک دیں گی۔“
 حالانکہ یہ کمیٹی انہوں نے اپنے علاج کے لیے ڈالی تھی مگر بیٹی کی اس فرمائش کو شاید وہ زندگی میں پہلی بار رد نہ کر سکیں۔

”بس اماں۔۔۔ پھر ان سے کہو ہمیں جلدی سے کمیٹی دے دیں۔“ ماں کی ہاں نے یک دم ہی اس کے دل کو خوشی سے بھر دیا۔

”اچھا۔۔۔“
 اماں نے باہر نکلتے ہوئے اس پر ایک نظر ڈالی جہاں خوشی کے سارے رنگ بکھرے ہوئے نظر آ رہے تھے۔
 ”یا اللہ اسے ہمیشہ اتنا ہی خوش رکھنا۔“ بے اختیار ہی ان کے دل سے یہ دعا نکلی۔
 ”آمین۔۔۔“ اپنی دعا پر خود ہی آمین کہتے ہوئے وہ باہر نکل گئیں۔

☆ ☆ ☆

”سالار نازیہ کو علاج کے لیے ملک سے باہر لے کر جا رہا ہے۔“
 اپنے تئیں فضا بھابھی نے اسے نئی خبر سنائی۔
 ”ہاں مجھے پتا ہے اس کا آپریشن ہے شاید پیٹ میں ٹیو مر ہے، میری تو دعا ہے اللہ اسے جلد ہی صحت و تندرستی عطا فرمائے۔“

”ہاں بھئی ہم سب کی تو یہی دعا ہے مگر اس آپریشن کے بعد ہو سکتا ہے وہ ساری زندگی ماں نہ بن سکے اور یہ اس کی زندگی کی کتنی بڑی خواہش ہے ہم سب ہی جانتے ہیں۔“
 ”مگر اللہ کی مرضی کے آگے ہم سب بے اختیار ہیں بھابھی۔“ وہ ٹھنڈی سانس بھرتے ہوئے اٹھ کھڑی ہوئی۔

”سنا ہے اس نے تو سالار کو دوسری شادی کی اجازت بھی دے دی ہے، مگر بھی آفرین ہے اس مرد پر جو اپنی بیوی سے اس قدر بے لوث محبت کرتا ہے کہ اسے ہر بیماری سمیت دل سے قبول کرنے پر آمادہ ہے، کہتا ہے مجھے صرف تازیہ کا ساتھ چاہیے۔ سچے غیر ضروری ہیں۔“

فضا بھی جو ایک بار شروع ہو میں تو بمشکل ہی چپ ہوا کرتی۔

”بھابھی عورت کوئی درخت نہیں جو پھل نہ دے تو کاٹ کر پھینک دیا جائے۔“

”نہیں بھئی یہ تو اپنی اپنی سوچ کی بات ہے، ورنہ آج کل تو لوگ بچوں والیوں کو بھی نکال باہر کرتے ہیں۔ کئی مرد بیٹوں کا سامانہ بنا کر دوسری گھر لے آتے ہیں اور سچی بات تو یہ ہے کہ نہ صرف مرد اس زمانے میں تو عورت کو بھی سکون نہیں۔ شادی شدہ ہوتے ہوئے بھی یہاں وہاں منہ مارتی ہیں۔ بس یہ عشق انسان کو کہیں کا نہیں چھوڑتا۔“

جانے وہ کیا جانا چاہتی تھیں زینب سمجھ نہ پائی۔

”آپ کے لیے چائے بناؤں۔“

انہیں اس موضوع سے ہٹانے کا کوئی اور طریقہ اس کی سمجھ میں ہی نہ آیا۔

”ہاں بنا لو، رانیور کسی کام سے گیا ہے اسے واپس آنے میں کچھ ٹائم لگے گا۔“ وہ ٹانگ پر ٹانگ دھرتے ہوئے اطمینان سے بولیں۔ زینب خاموشی سے کچن کی جانب بڑھ گئی۔



”مجھے تو ابھی بھی یقین نہیں آ رہا کہ تم میرے ساتھ ہو، ایسا لگ رہا ہے جیسے تمہارا یہ ساتھ صرف ایک خواب ہے جو آنکھیں کھولتے ہی ٹوٹ کر بکھر جائے گا۔“

جہاز کے ٹیک آف کرتے ہی وہ عریضہ کا ہاتھ تھامتے نہایت ہی پیار سے بولا۔

”سچ جانو یقین تو مجھے بھی نہیں آ رہا، وہ سب کچھ جو اس قدر مشکل اور دشوار لگ رہا تھا اتنی آسانی سے ہو جائے گا آئی کانٹ بلیواٹ۔“ وہ لفی میں سر ہلاتے ہوئے بے یقینی سے بولیں۔

”ہاں عریضہ نہ صرف ایسا ہوتا ہے بلکہ اب تو ہمارے ساتھ ہو چکا ہے اور ایسے ہی واقعات ہیں جو اللہ پر ہمارا یقین مزید مضبوط کرتے ہیں اور شاید اسی لیے کہا جاتا ہے کہ جوڑے آسمان پر بنتے ہیں اور ہمیں ہمیشہ وہی ملتا ہے جو ہمارے نصیب میں لکھ دیا جاتا ہے۔“

”ایک بات تو بتاؤ ایصال۔ اسے جیسے اچانک ہی کچھ یاد آ گیا۔

”تم نے اپنی کزن کو طلاق تو دی نہیں اور اگر کل وہ کسی بھی لمحہ تمہارے اور میرے درمیان آگئی تو۔“

دل کا خدشہ اس کی زبان پر در آیا۔

”ایسا کچھ نہیں ہو گا تمہارے اور میرے درمیان اب کوئی نہیں آ سکتا۔“

اس نے پیار سے اپنا بازو عریضہ کے گرد حما کیل کر کے اسے خود کے قریب کر لیا۔

”اور یہ خیال ہمیشہ کے لیے اپنے دل سے نکال دو مجھے فی الحال اب لوٹ کر پاکستان بھی نہیں جانا، وہ میرا ایک گزرا ہوا سچ ترین کل تھی جس کا خوف تمہارے ساتھ نے میرے دل سے بالکل نکال دیا ہے۔ اب اسے طلاق دینے یا نہ دینے سے مجھے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ اس کی اپنی زندگی کا معاملہ ہے چاہے تو میرے نام پر بیٹھ کر اسے برباد کر دے۔“

اس کے لہجہ کی سختی نے عریضہ کے دل میں موجود تمام خدشات کو دور کر دیا۔ وہ ایک دم ہی شانت ہو گئی اور پر سکون انداز میں ایصال کے کندھے سے اپنا سر نکالتے ہوئے آنکھیں موند لیں۔

”ملک صاحب آگئے ہیں۔“

کان سے لگا فون بند کرتے ہوئے فضل چاچا نے اطلاع دی۔
”اکیلے۔“

اس کے دل میں آنے والا خیال سیکنہ کی زبان پر سوال بن گیا۔
”ہتا نہیں۔“

چاچا مختصر سا جواب دیتے ہوئے داخلی دروازے کی جانب بڑھ گئے۔ وہ اپنی جگہ بے چینی سے پہلو بدل کر رہ گئی۔ کچھ ہی دیر بعد ملک انکل چاچا فضل کی ہمراہی میں اندر داخل ہوئے۔ وہ آج بھی تنہا تھے اس کا دل یکدم بجھ سا گیا۔

”السلام علیکم انکل۔“ وہ اپنی جگہ سے اٹھ کھڑی ہوئی۔
”وعلیکم السلام اکیسی ہو بیٹا۔“ اس کے سر پر دست شفقت رکھتے ہوئے ملک صاحب نے اسے خود سے قریب کر لیا۔

”میں بالکل ٹھیک ہوں۔“ خود بخود اس کی آواز بھگ سی گئی۔
”صاحب کے لیے کھانا لگاؤ۔“ ان کا مختصر سا سامان کمرے میں رکھ کر چاچا نے سیکنہ کو مخاطب کیا۔
”نہیں میں کھانا نہیں کھاؤں گا، ہو سکے تو ایک کپ کافی بنا دیں۔“
جانے کیوں انکل کچھ کچھ بچھے بچھے سے تھے یا شاید اسے وہم ہوا تھا۔
”اب تمہارا گریجویشن کے بعد کیا کرنے کا ارادہ ہے؟“ آنٹی کے کچن میں جاتے ہی ملک انکل نے اس کے قریب بیٹھتے ہوئے سوال کیا۔

”میرا ارادہ؟“
وہ یکدم گڑبڑا سی گئی۔ سوال اس کی توقع کے بالکل برخلاف تھا۔
”ہاں بیٹا، میں چاہتا ہوں تم ہائر ایجوکیشن حاصل کرو، ماسٹرز کر لو یا کوئی اور ڈگری جو تم کرنا چاہو۔“ انہوں نے تھکے تھکے انداز میں اپنا سر صوفہ کی بیک سے نکالیا۔
مطلب یہ کہ اس کا تہائی کا یہ سفر ابھی ختم نہیں ہوا، منزل ابھی بھی کہیں دور کھڑی تھی۔ وہ جو یہ سمجھ رہی تھی کہ گریجویشن کے بعد ملک صاحب اسے اپنے ساتھ لے جائیں گے۔ اس کا یہ خیال خام ثابت ہوا اس کی سمجھ میں ہی نہ آیا کہ وہ انہیں کیا جواب دے۔

”اگر تمہیں انٹرنسٹ ہو تو فیشن ڈیزائننگ کر لو۔“ اسے خاموش دیکھ کر وہ سیدھے ہو بیٹھے۔
”جیسے آپ مناسب سمجھیں۔“ اس کی آواز کچھ بھاری سی ہو گئی۔
سیکنہ نے چھوٹی سی ٹرائی ان کے صوفہ کے قریب کی۔
”آپ کافی لیس میں ذرا فریش ہو کر آتی ہوں۔“

اس وقت وہاں سے اٹھنے کا اس سے بہتر بہانہ اسے کوئی اور نہ سوجھا۔ ”اوکے بیٹا، ویسے آپ کا لنکشن کل کس وقت ہو گا۔“
”صبح دس بجے۔“

انہیں جواب دے کر وہ اندر اپنے کمرے میں آگئی اور پھر واش روم میں داخل ہوتے ہی دو پھوٹ پھوٹ کر

رونے لگی۔ وہ چاچا فضل اور سکیہ کے ساتھ قید تنہائی کاٹتے ہوئے تھک سی گئی تھی اور اب مزید اس گھر میں اس طرح زندگی گزارنے کا تصور بھی اس کے نزدیک سوبان روح تھا۔ جس کے خوف نے اسے اس طرح رونے پر مجبور کر دیا۔



”جیبیہ“
”اس نے اک ادا سے اپنے بالوں کو جھٹکتے ہوئے شاہ زین پر نظر ڈالی۔“
”کچھ نہیں۔“ جانے وہ کیا کہنا چاہتا تھا جو کہ نہ پایا۔
”اوکے۔“

کرید نے کی عبارت اس میں بالکل نہ تھی۔

”ایک بات پوچھوں۔“

کچھ دیر سوچنے کے بعد وہ اک بار پھر سے بول اٹھا۔

”پوچھو کیا پوچھنا چاہ رہے ہو۔“

پچھلے کچھ دنوں سے ان کے درمیان موجود تکلف کی دیوار تقریباً ”گرچکی تھی اور وہ دونوں دوستانہ انداز سے

ایک دوسرے کے قریب آگئے تھے۔

”تم نے کبھی محبت کی ہے؟“ بہت سوچتے ہوئے اس نے دھیرے سے سوال کیا۔

جیبیہ نے چونکتے ہوئے ایک نگاہ اس کے چہرے پر ڈالی، جہاں امید کے کئی جگنو جھلملا رہے تھے۔

”نہیں۔ ابھی تک کوئی ایسا ملا ہی نہیں جس سے محبت کی جاسکے۔“ اپنی گردن نفی میں ہلاتے ہوئے وہ نہایت

صاف گوئی سے بولی۔

”کمال ہے تم جیسی خوب صورت لڑکی کو محبت کرنے کے لیے کوئی ملا نہیں یا تم نے کبھی اپنے آس پاس دیکھا

نہیں۔“ شاہ زین کی آواز مزید گہیر ہو گئی۔

”واقف آپ کی آواز تو بہت خوب صورت ہے۔“

تعریف کے ساتھ ہی وہ کھلکھلا کر ہنس دی۔ شاہ زین کے آس پاس تقریبی گھنٹیوں کی آواز گونج اٹھی۔ وہ کچھ دیر

قبل والے طلسم سے باہر نکل آیا۔

”اور تمہاری ہنسی میری آواز سے کیس زیادہ خوب صورت ہے۔“ گھنی گھنی مونچھوں کے سائے تلے اس کے

لب مسکرائے۔

”چلو جی حساب برابر ہو گیا۔ تعریف کے بدلے تعریف اب چلیں۔“ اپنا ہینڈ بیگ سنبھالتے ہوئے وہ اٹھ کھڑی

ہوئی۔

شاہ زین جیسے جیسے اسے سمجھ رہا تھا اپنے سابقہ خیالات پر شرمندگی محسوس ہوئی۔ وہ تو خاصی نرم خور اور محبت

کرنے والی لڑکی تھی جبکہ شاہ زین اسے بد مزاج، مغرور اور جانے کیا کیا سمجھتا رہا۔

”چلو۔“

گاڑی کی چابی اٹھا تا وہ اس کے نہایت قریب آ گیا۔ اسے ہمیشہ سے یوں ہی جیبیہ کے سبک چلنا اچھا لگتا اس کی

ہمراہی میں پارکنگ تک آتے اس کے دل نے کئی بار اس ساتھ کے امر ہو جانے کی دعا کی۔



اس کا موڈ آج صبح سے ہی بہت خوش گوار تھا۔ نئے سوٹ کے ساتھ ہلکا ہلکا میک اپ کیے وہ ہمیشہ سے زیادہ حسین لگ رہی تھی۔ فرہاد کی پسند کا کھانا تیار کرتے ہوئے وہ ہلکا ہلکا گنگنا رہی تھی۔ جب بیرونی دروازہ کھول کر وہ اندر داخل ہوا۔

”باہر کا گیٹ کیوں کھلا ہوا ہے۔“ صحن میں آتے ہی اس نے زوردار آواز لگائی۔

”فائزہ کرایہ دے کر گئی تھی میں کنڈی لگانا بھول گئی۔“

اس نے جلدی سے کچن سے باہر نکل کر وضاحت دی۔ خلاف توقع وہ خاموشی سے لاؤنج کی جانب بڑھ گیا۔

”تم فریش ہو جاؤ میں کھانا لگا رہی ہوں۔“ زینب نے کچن کی جانب پلٹتے ہوئے اسے ہدایت دی۔

”اچھا۔۔۔“

اور جب وہ کھانا کی ٹرے لیے کمرے میں داخل ہوئی تو فرہاد ہاتھ میں کپڑا پکڑے کمرے میں موجود واحد کھڑکی صاف کرنے میں مصروف تھا بنا کچھ کے کھانا لکڑی کی چھوٹی سی ٹیبل پر رکھے وہ اس کے فارغ ہونے کا انتظار کرنے لگی۔

”تم میرے انتظار میں بلاوجہ بھوکے مت بیٹھو کھانا کھالو میں نہادھو کر فریش ہونے کے بعد کھاؤں گا۔“

بنا اس پر توجہ دیے وہ یہی اس نے کہا۔

”اچھا۔۔۔“ زینب کا خوش فہم دل مر جھسا گیا۔

”اسے اپنی جانب راغب کرنے کے لیے تو خود کو بدل“ اس سے لگاؤ کی باتیں کیا کر، اپنی محبت ظاہر کر، بچے یہ سب زندگی گزارنے کے لیے ضروری ہے۔“ ماں کا پرہایا ہوا سبق پہلے ہی مرحلے پر ناکام ہو گیا۔

”تم گھر کی ڈسٹنگ نہیں کرتی ہو۔ ٹیلی فون کا اسٹینڈ نہ گھوکس قدر گندا ہے کہ اس پر ہاتھ رکھنے کا تصور کم از کم میرے نزدیک تو قدرے محال ہے۔“

اب وہ پورے جوش و خروش سے فون کا اسٹینڈ صاف کر رہا تھا۔

”نگر میں نے تو سارے گھر کی صفا کی ہے پھر یہ گرد کہاں سے آگئی؟“ وہ حیرت کے ساتھ ساتھ تھوڑا سا چڑ بھی گئی۔

”تو تمہارا مطلب یہ ہوا کہ میں جھوٹ بول رہا ہوں۔“ حسب عادت نہایت ہی دھیمی آواز کے ساتھ وہ اسے گھورتا ہوا بولا۔

”میں نے ایسا کب کہا کہ تم جھوٹ بول رہے ہو؟“ زینب کی آواز نہ چاہتے ہوئے بھی تیز ہو گئی۔

”تم سے تو کوئی بات کرنا حرام ہے ہر وقت لڑنے کے لیے تیار کھڑی رہتی ہو جانے کس بات پر بلاوجہ چراغ بیا ہو رہی ہو میں نے تو ایسا کچھ نہیں کہا جس پر تم میرا سر پھاڑنے پر آمادہ دکھائی دے رہی ہو۔“

”میں آپ سے کب لڑی۔“ وہ قدرے حیران ہوئی۔

”تم ہمیشہ یہ کیوں ثابت کرنے کی کوشش کرتی ہو کہ میں جھوٹا ہوں۔“ چہرے پر زمانے بھر کی معصومیت طاری کرتے ہوئے وہ طنزیہ بولا۔

”اور یہ تم کہیں جا رہی ہو جو اس قدر تیار ہو۔“

اسے مکمل طور پر پتانے کے بعد اب اس کی توجہ زینب کے سراپے کی جانب مرکوز ہوئی۔

”نہیں ویسے ہی نیا سوٹ سل کر آیا تھا۔ اس کی فٹنگ چیک کر رہی تھی۔“

غصہ اور دکھ کی شدت سے اس کی آواز بھرا سی گئی جس پر فرہاد نے کوئی توجہ نہ دی۔

”اگر سوٹ سل کر رہی آگیا ہے تو ضروری تو نہیں کہ اسے گھر پر پن کر خراب کیا جائے اتنا مہنگا سوٹ تم نے

کچن کے کاموں میں ہی برباد کر دیتا ہے۔“ اس کی گفتگو اب دوسری پٹری پر چڑھ گئی۔
زینب خاموشی سے اندر واش روم میں آگئی، کپڑے تبدیل کر کے اس نے خوب رگڑ رگڑ کر اپنا منہ بھی دھو
ڈالا۔ اس تمام عمل میں آنسو مسلسل اس کی آنکھوں سے بہہ کر چہرہ بھگوتے رہے۔



”بہاروں پھول برساؤ میرا محبوب آیا ہے۔“
بے ڈھنگی آواز کے ساتھ ہی شو کے کابے ہنگم ققمہ اس کی سماعتوں سے ٹکرایا مارے خوف کے اس کے قدم
خود بخود تیز ہو گئے۔

”ارے کیا ہوا کیوں اس قدر بھاگی جا رہی ہو۔“
اس کا ساتھ دینے کی کوشش میں ہلکان ہوئی ارم نے اسے بازو سے تھام کر روکنا چاہا۔
”کچھ نہیں بس ایسے ہی ڈر گئی تھی۔“
ارم پر نظر ڈالتے ہوئے اس نے اپنے پیچھے پلٹ کر دیکھا۔ شو کا دور دور تک کہیں نہیں تھا۔ اس کے قدموں کی
رفتار خود بخود ہم ہو گئی۔
”میرا خیال ہے تم اس خبیث شو کے سے ڈر گئی تھیں۔“

”ہاں۔“

اب چھپانے کا کوئی فائدہ نہ تھا۔
”ارے وہ منحوس تو پیچھے اس بک اسٹال پر ہی کھڑا تھا، تم جانے کیوں ڈر کر بھاگ کھڑی ہوئیں۔ حد ہے۔“ ارم
کی بات سنتے ہی وہ شرمندہ سی ہو گئی۔
”تم اپنی اماں کو شو کے کی حرکتوں کے بارے میں کیوں نہیں بتاتیں، تاکہ وہ اس کے گھر جا کر اس کی اماں یا باپ
سے شکایت کر دیں، ہو سکتا ہے اس طرح ہی وہ سدھر جائے۔ سنا ہے اس کا باپ کافی سخت آدمی ہے اور وہ اس سے
ڈرتا بھی ہے۔“

ارم بے خبر تھی کہ اماں ہر بات جانتی ہیں۔ اس نے بھی بتانا ضروری نہیں سمجھا، کیونکہ ان تمام باتوں کا کوئی
فائدہ نہ تھا، اسی لیے خاموشی سے سنتی رہی۔

”مجھے نہیں لگتا کہ وہ اپنے گھر والوں سے ڈرتا ہوگا۔“ کندھے پر ڈھکتی چادر اس نے اچھی طرح سر پر جمائی۔
”چلو لعنت بھیجو شو کے پر یہ بتاؤ امروہ کھاؤ گی۔“
سامنے ہی چھابڑی میں امروہ سجائے چا چار مضان اپنی مخصوص جگہ پر بیٹھا تھا۔

”ہاں۔“

اثبات میں سر ہلاتے وہ اس کے ساتھ ہی آگئی۔ ہرے ہرے امروہ اسے بہت پسند تھے۔ ارم نے ہی پیسے دے
کر امروہ خریدے، چھوٹی چھوٹی پلاسٹک کی دو تھیلیاں، ایک اس کی جانب بڑھا دی۔ بنا کچھ کہے اس نے خاموشی
سے تھیلی تھام لی۔ یہ امروہ کی تھیلی اس پر ایک طرح کا قرض تھی۔ ہمیشہ ایسا ہی ہوتا ارم جب بھی اپنی جیب خرچ
سے اسے کچھ لے کر دیتی بد لے میں وہ بھی اسے کچھ نہ کچھ ضرور دے دیا کرتی، ان کی یہ دوستی اسی طرح قائم و دائم
تھی۔



فون کے دو سرے سرے پر یقیناً "ایشال تھا۔ جس کی اتنے دنوں بعد سنی جانے والی آواز نے بھی ملک صاحب کے اندر کی پر مڑی کو دو نہیں کیا۔ انہوں نے فون اپنے کان سے ذرا سادہ کرتے ہوئے ایک ترجمہ نظر کچھ فاصلے پر کھڑی اس ہستی پر ڈالی جسے انہوں میں لے جانے کی خواہش نے انہیں شاید خود بھی انہوں سے دور کر دیا تھا۔
 "وعلیکم السلام بیٹا۔"

آہستہ سے جواب دیتے ہوئے انہوں نے ایک گہرا سانس خارج کیا۔
 "پاپا ہم خیریت سے لندن پہنچ گئے ہیں۔ اس لیے سوچا آپ کو بھی اطلاع کروں۔"
 دو سری جانب موجود ایشال کا جوش و خروش ان کی سرد آواز نے خاصا کم کر دیا تھا۔
 "مما سے میری بات ہوئی تھی۔ انہوں نے بتایا آپ آؤٹ آف سٹی ہیں۔ اس لیے سوچا آپ سے بھی بات کر لوں۔ آپ بڑی تو نہیں تھے۔"

ان کی طویل خاموشی کو محسوس کرتے ہوئے ایشال نے سوال کیا۔
 "ہاں اس وقت میں ایک ضروری میٹنگ میں ہوں تم سے بعد میں بات کرتا ہوں۔"
 "اوکے پاپا ٹیک کیر اللہ حافظ۔"

ایشال کے فون بند کرنے ہی انہیں اپنی سرد مہری کے احساس نے گھیر لیا۔
 "غلطی میری ہی تھی مجھے بنا سوچے سمجھایہ رشتہ نہیں کرنا چاہیے تھا۔ ہر شخص خواہ وہ میری اپنی اولاد ہی کیوں نہ ہو زندگی اپنی مرضی سے گزارنے کا حق دار ہے اور یہ حق اسے اللہ کی طرف سے ملا ہے۔ پھر ہم کون ہوتے ہیں کسی سے اس کا یہ حق چھیننے والے ہمارے یہ بات مجھے پہلے سمجھ آگئی ہوئی تو اتنی بھاری ذمہ داری اپنے کاندھوں پر نہ لیتا۔"

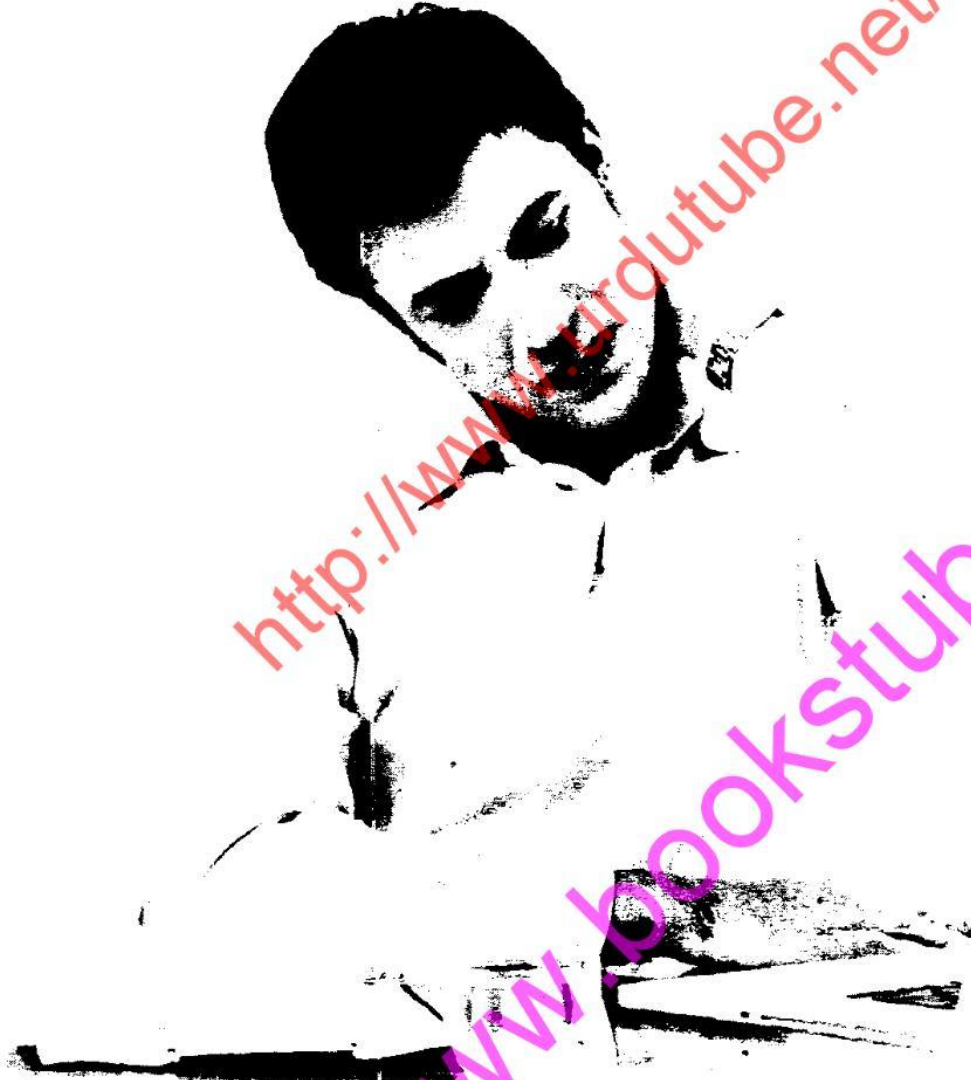
انہوں نے نظراٹھا کر سامنے دیکھا جہاں آف وائٹ سوٹ میں تیار کھڑی وہ انہیں منتظر نگاہوں سے دیکھ رہی تھی۔

"ایشال کی حد تک تو ٹھیک تھا مگر اب اس کا کیا ہو گا جو کچھ اس کے ساتھ ہو چکا ہے میں اس معصوم بچی کو کس طرح بتاؤں۔"

"انکل چلیں دس بجنے والے ہیں۔"
 ملک صاحب کو کسی گہری سوچ میں ڈوبا دیکھ کر اس نے پکارا۔
 "ہاں چلو۔" وہ اٹھ کھڑے ہوئے۔
 "سیکنہ۔۔۔ سیکنہ۔۔۔"

کھڑے ہوتے ہی انہوں نے آواز لگائی۔
 "جی صاحب جی۔" سیکنہ کچن سے بھاگ کر باہر نکل آئی۔
 "اپنا سارا ضروری سامان پیک کر لو تم سب لوگ میرے ساتھ کراچی چل رہے ہو۔"
 ان کے اس چھوٹے سے جملے نے وہاں موجود ہر فرد کے چہرے پر خوشی کی لہر دوڑادی۔
 "شکراً الحمد للہ۔" سیکنہ زیر لب برید مالی۔

ہمیں کب تک جانا ہے؟
 جب وہ بولی تو خوشی اس کی آواز سے جھلک رہی تھی۔ اس نے تو پچھلے کئی سالوں سے اپنی زندگی کی ہر خوشی کو اس چھوٹی سی لڑکی کے نام سے منسوب کر لیا تھا۔ جسے اس نے اپنی اولاد کی طرح چالا تھا۔
 "جلد ہی۔۔۔ میرا خیال ہے ایک دو دن تک۔"



رومائل آئل

رومائل سے فوری آرام، درد کا کام کرے تمام

کمر کے درد، جوڑوں کے درد، پٹھوں کے کھچاؤ، جوڑوں کی سوزش
اور مویج کے درد سے فوری نجات پائیں



f Marhaba Laboratories

UAN: 111-152-152

www.marhaba.com.pk

جواب دیتے ہوئے وہ باہر کی جانب بڑھ گئے۔
 ”اپنی اولاد کی خوشیوں کی خاطر مجھے اس بچی کی زندگی برباد نہیں کرنا چاہیے۔“
 دماغ میں در آنے والی اس سوچ نے انہیں یقیناً ”کسی فیصلے تک پہنچا دیا تھا جس کا انداز ان کے چہرے کو دیکھ کر
 بخوبی لگایا جاسکتا تھا۔



اماں کو رات سے بھر بخار تھا۔ اس لیے آج وہ اسکول بھی نہیں گئی، چائے بنا کر بمشکل انہیں ناشتا کروایا اور پھر
 اپنا مختصر سناشتا لیے صحن میں پیچھی چارپائی پر آ بیٹھی، جب بیرونی دروازہ کھول کر فاطمہ خالہ اندر داخل ہوئیں۔
 ”کیسی طبیعت ہے اب تمہاری ماں کی؟“ اس کے پاس سے گزرتے ہوئے لمحہ بھر کو رہیں۔
 ”بخار بہت تیز ہے۔“ اس نے آہستہ آواز میں جواب دیا۔
 ”اللہ بہتر کرے گا۔“

خالہ نے اس کے سر پر ہاتھ رکھتے ہوئے دعا کی اور اندر کی جانب بڑھ گئیں۔ اس نے چائے کا آخری گھونٹ
 بھرا، لیکن میں موجود تمام برتن دھونے کے بعد خود بھی اندر کمرے میں ہی آگئی، جہاں فاطمہ خالہ اماں کے قریب ہی
 چارپائی پر بیٹھی تھیں۔ اماں کی طبیعت رات کے مقابلے میں خاصی بہتر نظر آرہی تھی۔
 ”میں نے آفتاب سے کہا ہے وہ تمہیں آج شام اسپتال لے جائے گا۔“ آفتاب ان کے بڑے بیٹے کا نام تھا۔
 ”اللہ تعالیٰ تمہیں صحت و تندرستی عطا فرمائے۔ اس بچی کا خدا کے بعد تم واحد سہارا ہو، سوچو اگر تمہیں کچھ
 ہو گیا تو یہ غریب کہاں جائے گی۔“

خالہ نے اماں کا ہاتھ اپنے ہاتھوں میں تھام لیا۔ وہ خاموشی سے چارپائی کے نزدیک جا کھڑی ہوئی۔
 ”نہیں خالہ مجھے اسپتال نہیں جانا ہے ذرا بخار ہے، دوائی لوں گی تو ان شاء اللہ رات تک ٹھیک ہو جاؤں گی۔“
 ”یہ بخار بار بار کیوں ہو رہا ہے؟ یہ بات تم خود بھی اچھی طرح جانتی ہو۔“ فاطمہ کے لہجہ میں پیار بھری خفگی
 آگئی۔

”بیماری کو نظر انداز کرنے سے بیماری ختم نہیں ہوتی اور نہ ہی کم ہوتی ہے، بلکہ بڑھتی ہے اور اپنی بیماری تم خود
 بڑھا رہی ہو۔“ اسے مسلسل نظر انداز کر کے، ”اماں کو کیا بیماری تھی وہ سمجھ نہ پائی۔“
 ”میری مائے ناتو اپنے علان پر توجہ دو، باقی جو مولا سائیں بہتر کرے ہوتا تو وہ نہ ہی ہے جو اس سوئے رب نے مقدر میں
 لکھ دیا ہے، مگر انسان کو اپنے حق میں ہمیشہ اچھے کی کوشش ضرور کرنی چاہیے ہمارے رب کا بھی یہی حکم ہے۔“
 خالہ میرا ایک کام ہے اگر آپ کر سکیں تو۔
 اماں نے جیسے خالہ کی تمام باتوں کو نظر انداز کر دیا۔
 ”ہاں بیٹا بولو۔“

”جاؤ ایک کپ چائے بنا لاؤ۔“
 اماں نے پھوٹی ہوئی سانسوں کے ساتھ اسے مخاطب کیا۔ وہ سمجھ گئی اماں اس کے سامنے بات نہیں کرنا
 چاہتیں اس لیے خاموشی سے باہر نکل آئی۔ جب وہ چائے لے کر کمرے میں آئی تو اماں نے اپنے قریب رکھا چھوٹا
 سا پرانا باکس بند کر کے اس کے حوالے کر دیا۔
 ”یہ ٹرنک میں رکھ دو۔“

وہ اس باکس کو ٹرنک میں رکھ کر واپس پلٹی تو خالہ نے ہاتھ میں پکڑا کاغذ کا ٹکڑا نہایت احتیاط سے اپنے دپٹے کے

پلو سے باندھ لیا۔

”اچھا بیٹا اب میں چلتی ہوں۔“ خالی کپ انہوں نے اس کے حوالے کیا۔
”اگر اس فون نمبر پر میرا رابطہ نہ ہو سکا تو ان شاء اللہ آفتاب کو اس پتے پر ضرور بھیجوں گی، تاکہ وہ وہاں جا کر ان سے خود ملے اور تمہارا تمام حال من و عن بیان کر سکے، مجھے امید ہے اللہ تعالیٰ ضرور کوئی بہتری کی صورت نکالے گا۔ بس تم اس سے اچھے کی امید رکھو۔“
انہیں تسلی دے کر وہ باہر نکل گئیں۔
”یا سکین، آیا آرہی ہیں۔“



فراد نے لیوی سے نظریں ہٹا کر اسے اطلاع بہم پہنچائی۔

”اچھا کب۔“

اس کے ہاتھ مریم کا بیگ پیک کرتے کرتے رک گئے۔

”شاید کل شام تک۔“

”خیریت سے آ رہی ہیں۔“ ان کی آمد کبھی بھی بلا سبب نہ ہوتی تھی۔

”تم ان کے میاں کو تو جانتی ہو، کس قدر بد ذات آدمی ہے۔ اپنی زندگی میں خود سکون کرتا ہے اور نہ ہی دوسروں کو کرنے دیتا ہے۔ ہماری اتنی اچھی نیک اور سیدھی بہن کے نصیب میں یہ ہی گھٹیا شخص رہ گیا تھا۔“
فراد ہمیشہ اپنے بہنوئی کے لیے ایسے ہی الفاظ استعمال کرتا جس کی وہ عادی تھی، مگر پھر بھی یہ اس کے سوال کا جواب نہ تھا۔

”جب رشتہ لینا تھا تو ہمارے آگے پیچھے پھرتے تھے اور اب ایسی ماتھے پر آنکھیں رکھی ہیں جیسے جانتے ہی نہیں۔“

”تو کیا آپا کو کوئی جھگڑا ہو گیا ہے؟“ اس تمام تمہید سے اس نے یہی نتیجہ نکالا۔

”نہیں اس خبیث نے اب اپنا کاروبار شروع کرنا ہے، جس کے لیے کچھ رقم درکار ہے۔ وہ لینے آپا کو بھیجا ہے،

حالانکہ اس سے قبل صبر انہیں میسے بھیج چکا ہے۔“

”اوہ وہ تو بھول ہی گئی تھی، آپا کی اکثر و بیشتر آمد ایسے ہی کسی مقصد کے لیے ہوتی تھی۔“ اچھا۔“

اس نے خاموشی سے مریم کا بیگ پیک کر کے رکھا۔ آپا کے شوہر سے تو اس کا زیادہ واسطہ نہ پڑا تھا، مگر آپا کی آمد اس کی زندگی میں موجود تھوڑے سے سکون کو ضرور درہم برہم کر دیا کرتی تھی اور یقیناً ”اب ایسا ہی ہونے والا تھا۔“



”شاہ زین یہاں آؤ۔“

ممانے اپنے سامنے رکھے لیپ ٹاپ سے نظریں ہٹا کر اسے دیکھا۔

”جی ممانے۔“

وہ خاموشی سے ان کے قریب آن کھڑا ہوا۔

”یہ لڑکی دیکھو کیسی ہے؟“

لیپ ٹاپ کی اسکرین پر نظر آنے والی لڑکی اس کے لیے قطعی اجنبی تھی۔

”یہ کون ہے؟“ اس نے حیرت سے ممانے کی جانب دیکھتے ہوئے سوال کیا۔

”میری دوست کی بیٹی ہے، بلکہ تمہارے پاپا سے تو ان کی دور کی رشتہ داری بھی ہے۔ ماشا اللہ بہت پیاری بچی ہے۔“

”حیرت ہے، میری تو میری اس سے کبھی ملاقات نہیں ہوئی۔“

”ملاقات بھی ہو جائے گی، پہلے یہ بتاؤ لڑکی کیسی ہے، بڑی قابل ڈاکٹر ہے۔“ ممانے لیپ ٹاپ کا رخ مکمل طور پر اس کی جانب کر دیا۔
”اچھی ہے۔“

مختصر سا جواب دے کر اس نے ٹیبل پر رکھا ہینا سیل فون اٹھالیا۔
”ہم چاہتے ہیں کہ اب تمہاری شادی کر دی جائے۔“
اس کی طرف سے کیے جانے والے کسی بھی ممکنہ سوال سے ناامید ہونے کے بعد ممانے خود ہی بات آگے بڑھائی۔

”اسی سلسلے میں میں تمہیں لڑکی دکھا رہی تھی۔ اگر تمہیں پسند ہو تو ہم بات آگے بڑھائیں۔“
بلی کھیلے سے باہر آگئی۔ وہ ممائی باندھی جانے والی تمہید کی وجہ شروع میں ہی سمجھ چکا تھا۔ صرف ان کے منہ سے سننا چاہتا تھا۔

”پلیز ممائی! آپ اس سلسلے میں کسی کی بیٹی کو کوئی امید مت دلائیں اور نہ ہی مجھ سے پوچھے بغیر کہیں رشتہ دیکھنے جائیں۔ مجھے جب شادی کرنا ہوگی میں خود ہی آپ کو بتا دوں گا۔“
”تھک ہے، مگر کب تک؟“ ممائی لیپ ٹاپ بند کر کے اٹھ کھڑی ہوئیں۔
”اور اگر تمہیں کوئی لڑکی پسند ہے تو ہمیں اعتراض نہیں، مگر کوشش کرو جو فیصلہ کرنا ہے جلد کرو، میں اب گھر کی تنہائی سے آتا گئی ہوں۔“

ممائی بات ختم ہوتے ہی جیبہ کا سراپا چھم سے اس کے تصور میں اتر آیا اور اس کے لب خود بخود مسکرا اٹھے۔
”میں کوشش کروں گا ممائی! آپ کی یہ خواہش جلد پوری کر سکوں۔“
ماں کے کندھے پر اپنا ہاتھ رکھتے ہوئے اس نے مکمل یقین دہانی کرائی۔ ایک طرف سے مسئلہ حل ہو چکا تھا۔
اب اسے صرف جیبہ سے بات کرنی تھی۔ جس کے لیے وہ موقع کا منتظر تھا۔

”تین تین بیٹے دیے ہیں میں نے اس شخص کو، مگر وہ کچھ لو قدر نہیں۔“
یا سمین آپا نے چائے کا آخری گھونٹ بھرا، تین بیٹوں کی ماں ہونے کا مان ان کے لہجہ میں ہمیشہ ہی جھلکتا تھا۔
”جی۔“ وہ صرف اس قدر ہی کہہ سکی۔

”اور ایک میرا بھائی ہے، کبھی نہیں سوچا کہ ایک بیٹا بھی ہونا چاہیے۔“
ان کا اشارہ یقیناً ”فرہاد کی جانب تھا۔
”بیٹی یا بیٹا کچھ اپنے اختیار میں نہیں ہوتا، یہ سب دینے والی ذات صرف اللہ کی ہے۔“ اسے یا سمین آپا کی بات خاصی بری لگی۔

”دینے والا تو اللہ ہی ہے، مگر لوگ کبھی یہ سب سمجھتے ہیں اب میرے دیور کو ہی دیکھ لو یہاں تیسری بیٹی پیدا ہوئی وہاں دوسری بیوی کر لی۔“
”ہر شخص آپ کے دیور جیسا نہیں ہوتا۔“

اب ان کے پاس مزید بیٹھنا محال تھا۔ وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔
”ہاں بھئی خوش نصیب ہے جو فرہاد جیسا شوہر ملا، سیدھا ساہ کسی معاملے میں نہ بولنے والا۔ ایک ہمیں دیکھو ہر وقت کی جھج جھج۔“
وہ ہمیشہ سے ایسی ہی باتیں کیا کرتیں۔

”قبر کا حال صرف مردہ جانتا ہے۔ آپا ہر والوں کو سب کچھ ٹھیک اور اچھا نظر آتا ہے۔“
آہستہ آواز میں جواب دیتی وہ بچن میں آگئی، تاکہ رات کے کھانے کی تیاری کر سکے۔

☆ ☆ ☆
اماں گھر آئیں تو خاصی گھبرائی ہوئی تھیں۔ اندر داخل ہوتے ہی انہوں نے دروازے کی کنڈی لگا دی۔
”کیا ہوا اماں؟ کیوں اتنی پریشان ہو؟“ وہ تیزی سے ماں کی جانب بڑھی۔
”کچھ نہیں، گلی میں پولیس آئی ہے، شوکے، دوست ارشد علی کو گرفتار کرنے۔“
ماں نے ہاتھ میں بھی دو ایسوں کا لفافہ قریبی ٹیبل پر دھرتے ہوئے اپنی چادر سے منہ پونچھا۔
”پھر کسی کی جیب کالی ہوگی یا سائیکل چوری کی ہوگی۔ ان دونوں کا تو یہ ہی کام ہے، مگر تم کیوں اس قدر پریشان ہو رہی ہو۔ اچھا ہے پولیس لے جائے، جان چھوٹے محلے والوں کی۔“
پاپی کے کونر سے سلور کا کٹورا البالب بھرا اور ماں کے قریب آگئی۔
”نہیں اس بار ایسا کچھ نہیں ہے۔“ ماں نے چارپائی پر بیٹھتے ہوئے پاپی کا کٹورا اٹھام لیا۔
”اس بار سنا ہے اس نے شوکے، کے ساتھ مل کر کوئی لڑکی اغوا کی تھی اور پھر دونوں نے مل کر اسے مار دیا۔ لڑکی کی لاش کسی خالی پلاٹ سے لی ہے۔“

”اوہ۔۔۔“
ماں کی دبی جانے والی اطلاع نے اسے بھی خوف زدہ کر دیا اور یک دم ہی اس کا چہرہ لمبے کی طرح سفید ہو گیا۔
”اچھا ہے، اب ان دونوں بد معاشوں کو پولیس پکڑ کر لے جائے گی۔ کم از کم اس طرح محلے والوں کو تو سکون نصیب ہو گا۔“

”سکون کیسا شوکے، کے باب کے پاس تھوڑا حرام کا بیہ سے، مکا کر کے بیٹے کو چھڑوا لے گا۔“
یہ بات بھی سچ تھی، وہ خاموش ہو گئی، سارے خوف کے اس کا دل اب بھی تیزی سے دھک دھک کر رہا تھا۔
”آج کتنے ہی دن ہو گئے خالہ فاطمہ کو فون نمبر دیے ہوئے، مگر انہوں نے کچھ بتایا ہی نہیں۔“ کچھ سوچتے ہوئے
اماں زیر لب بڑبڑائیں۔
”کس کا فون نمبر اماں۔“

وہ چارپائی پر ان کے نزدیک ہی بیٹھ گئی۔
”مے میرے ایک قریبی عزیز کا۔“
آج پہلی بار ماں کے منہ سے قریبی عزیز کا لفظ سنا تھا۔ اسے قدرے حیرت ہوئی۔
”سوچ رہی ہوں نکروالے پی سی او جا کر انہیں خود ہی فون کر لوں، میرا کس تو نکال کر لانا، وہ جواب دے کے ٹرک میں رکھا ہے۔“

وہ یہ باکس کئی بار وہاں سے نکال کر لاتی تھی۔ مگر پھر بھی اماں ہر بار اسے جگہ کی یاد دہانی ضرور کرواتیں، اس نے خاموشی سے باکس لا کر ان کے قریب رکھ دیا۔ اماں نے کھول کر اندر سے ایک کارڈ نکالا اور مٹھی میں دباتے ہوئے پھر سے اٹھ کھڑی ہوئیں۔

”یہ واپس اپنی جگہ رکھ آؤ میں ابھی آتی ہوں۔“
”رکو اماں مجھے بھی ساتھ لے کر جانا میں نے اکیلے گھر میں نہیں رہنا۔“
کچھ دیر قبل والی خبر کا خوف ابھی بھی پوری طرح اس کے اندر پنچے گاڑھے بیٹھا تھا۔ اسے خالی گھر میں ہر طرف شوکے کا ہولہ دکھائی دے رہا تھا۔ اماں نے رک کر ایک نظر اس کے چہرے پر ڈالی۔

”اچھا آجا، مگر اپنی چادر لے کر آتا۔“

اسے ہدایت دیتیں وہ باہر کی جانب بڑھ گئیں۔ وہ تیزی سے باکس اپنی جگہ واپس رکھ کر اماں کے پیچھے لپکی، دروازے کو باہر سے کندی لگائے وہ دونوں ماں بیٹیاں صغیر لی سی او آگئیں۔ اپنی زندگی میں پہلی بار وہ اس لی سی او آئی تھی اور شاید زندگی میں پہلی بار اس کی ماں کسی کو فون کرنے آئی تھی۔ ورنہ آج تک وہ یہ ہی سمجھتی رہی کہ ان کا اس دنیا میں کوئی ایسا عزیز نہیں ہے جسے فون کرنے کی کبھی ضرورت پیش آئے۔ لی سی او پر رش تھا ہر وہ لگا کر عورتوں کا حصہ علیحدہ کر دیا گیا تھا۔ وہ اندر والے حصے میں جا بیٹھیں۔ چھٹی کا دن تھا۔ کلی میں کرکٹ کھیلتے بچوں کا شور اندر تک سنائی دے رہا تھا۔

”لاکس نمبر دیں۔“

ان سے پہلی والی عورت کے فارغ ہوتے ہی فون کے قریب بیٹھے شخص نے آواز لگائی، ماں نے جلدی سے ہاتھ میں پکڑی پرچی اسے تھما دی۔ دکان والے نے نمبر ملانے کے بعد فون ماں کے ہاتھ میں دے دیا۔ وہ بدولی سے باہر کھیلنے بچوں کو دیکھنے لگی۔ ماں کی طرف سے اس کی توجہ بالکل ہٹ گئی۔ جب اچانک ماں کی نسبتاً ”تیز آواز اس کے کانوں سے ٹکرائی۔“

”آپ کو کچھ علم ہے، وہ کب تک واپس آئیں گے۔“

ماں کے لمبے میں مایوسی تھی دوسری طرف سے کیا کہا گیا اسے آواز نہ آئی ماں کس سے بات کرنا چاہتی تھی اپنی بے دھیانی میں وہ سن ہی نہ پائی اسے بے حد افسوس ہوا۔

”اچھا میرا کوئی فون نمبر تو نہیں ہے مگر وہ جب بھی آئیں ان سے کہنا میرا فون تھا۔“ ماں اتنا کہہ کر رک گئیں۔ ”اس نے تو کہا تھا تم زندگی میں جب بھی مجھے پکارو گی میں تمہیں اپنا مختصر ملوں گا۔“ ماں کی بڑبڑاہٹ اس کے کانوں سے ٹکرائی۔

”میرا نام۔“ ماں زیر لب بڑبڑائیں۔

فون کی دوسری جانب موجود شخصیت نے یقیناً ”ماں کا نام پوچھا تھا وہ ہمہ تن گوش ہو گئی اسی پل کسی نے دکان کے سامنے موجود آم کے درخت پر پتھر مارا بہت ساری چیزوں کا تیز شور اس کی سماعتوں سے ٹکرایا ”نام میں کیا رکھا ہے۔ ان سے کہنا میں ہفتہ بھر میں پھر سے فون کروں گی ایک ہفتہ تک واپس تو آجائیں گے نا۔“ وہ جاننا چاہتی تھی کہ ماں کس کو فون کر رہی ہے مگر یاد جود کوشش کے اسے ناکامی ہوئی ماں نے اپنی مطلوبہ شخصیت کا دوبارہ نام بھی نہ لیا ”میرا نام تو شاید اب انہیں یاد بھی نہ ہو گا اس لیے بتانے کا کیا فائدہ۔“ چلو پھر ایک ماہ بعد کر لوں گی فون اللہ حافظ۔“

فون بند کرتے ہی انہوں نے منھی میں دے روپے دکان والے کے حوالے کیے باقی رقم واپس دوپٹے کے پلو میں لپیٹتی اور اسے ساتھ لیے دکان سے باہر نکل آئیں گھر سے لی سی او جاتے سے ماں کے قدموں میں جو تیزی تھی وہ اب قدرے کم ہو چکی تھی تیز دھوپ میں دھیرے دھیرے قدم اٹھانی ماں کی سنگت میں اس نے اپنے گھر کی دہلیز کے اندر قدم رکھ دیے۔

☆☆☆

گاڑی کے سگنل پر رکتے ہی اس کی نگاہ دائیں جانب سڑک کے کنارے کھڑے اس لڑکے پر پڑی جس کے ہاتھوں میں تھے سرخ تازہ گلاب کے پھول دیکھنے والوں کی نگاہوں کو ایک تراوٹ بخش رہے تھے۔ ”سر آپ کو کیسے پتا چلا مجھے سرخ گلاب بہت پسند ہیں۔“

کانوں میں جیبہ کی آواز آتی ہی وہ چونک اٹھا فوراً اشارے سے اس لڑکے کو اپنے قریب بلایا۔ ”یہ سارے پھول پیچھے سیٹ پر رکھ دو۔“

پرس نکال کر بن مانگے ہی کچھ نوٹ اس لڑکے کو تھما دیے جنہیں دیکھتے ہی اس کے چہرے پر پہلے حیرت اور پھر یکدم خوشی کی لہری دوڑ گئی۔

”تھینک یو سر“ خوشی سے اس نے شاہ زین کو سلوٹ مارا۔

سبز بتی روشن ہو گئی اس نے تیزی سے گاڑی آگے کی سمت بڑھائی وہ جلد از جلد آفس پہنچ کر یہ سارے پھول حبیبہ کو دینا چاہتا تھا تیز رفتاری کے باعث وہ چندہ منٹ کے لگ بھگ آفس کی پارکنگ میں موجود تھا گاڑی پارکنگ میں چھوڑ کر وہ دو دو سیڑھیاں پھلانگتا اور پہنچا اسے کسی بہانے حبیبہ کو نیچے گاڑی تک لانا تھا وہ آفس میں سب کے سامنے یہ پھول دے کر اس کا کوئی تماشہ بنوانا نہیں چاہتا تھا اسے ہمیشہ خدشہ رہتا کہیں وہ کسی چھوٹی سی بات کو لے کر ناراض نہ ہو جائے کیونکہ وہ ایسی ہی تھی پھولی ہوئی سانسوں کے ساتھ وہ آفس ہال کے بڑے سے داخلی دروازے کے سامنے جا کھڑا ہوا قریب لگے آئینہ میں اپنا اچھی طرح جائزہ لے کر ٹائی کی ناٹ ٹھیک کی تیز تیز چلتی سانسوں کو بحال کیا۔

”السلام علیکم صاحب۔“ دروازے پر ہاتھ رکھتے ہی کرم دین اسے دھکیلتا ہوا باہر نکل آیا۔

”وعلیکم السلام۔“

سر کی جنبش سے سلام کا جواب دیتا وہ اندر داخل ہوا سامنے ٹیبل پر کرن اپنے کمپیوٹر میں مصروف تھی اس سے چند قدم دور حبیبہ کی ٹیبل اس کے وجود سے یکسر خالی تھی ٹیبل کے نیچے موجود کرسی اس بات کی علامت تھی کہ اسے باہر ہی نہیں نکالا گیا۔

”حبیبہ کہاں ہے؟“ صاف لگ رہا تھا وہ آج نہیں آئی پھر بھی وہ کرن سے تصدیق کرنا چاہتا تھا۔

”وہ تو آج نہیں آئی سر۔“

”اوہ۔!“ کچھ دیر قبل والی اس کی ساری خوشی یکدم کافور ہو گئی۔

”خیریت۔“

اس کا اشارہ حبیبہ کی غیر حاضری کی سمت تھا۔

”جی سر اس کے مڈ ٹرم ختم ہوئے ہیں جس کے بعد اس کی یونیورسٹی تقریباً دس دن کے لیے بند ہوتی ہے لہذا یہ

دس دن وہ اپنے چاچا کے ساتھ گزارتی ہے۔“

اسے حیرت ہوئی حبیبہ نے اسے کل کیوں نہیں بتایا کہ وہ ایک ہفتہ کی چھٹیوں پر جا رہی ہے شاہ زین نے اپنے آفس میں قدم رکھتے ہی موبائل نکال کر اس کا نمبر لایا حبیبہ کا سیل آف تھا اس کا خوشگوار موزیک دم ہی خراب ہو گیا جب رات گھر واپس آیا تو سرخ گلابوں کی مہک پوری گاڑی میں پھیلی ہوئی تھی اس کا دل نہ چاہا ان پھولوں کو نکال کر پھینک دے جو خریدنے سے قبل حبیبہ کے نام منسوب کر چکا تھا گھر آتے ہی اس نے تمام پھول نکال کر اپنے روم فرنیچ میں رکھ دیے۔

ہر انسان کی زندگی میں ایک ٹرنک پوائنٹ ضرور آتا ہے جس کے بعد اس کی زندگی مکمل طور پر تبدیل ہو جاتی ہے مگر اس کی زندگی میں یہ پوائنٹ دوسری بار آگیا تھا پہلی بار جب وہ اپنی ماں گھریا، سکھی ساتھیوں اور محسن میں لگے پیپل کے بڑے سے بیڑ سمیت سب کچھ چھوڑ چھاڑ ملک صاحب کی سنگت میں چاچا افضل اور آنٹی سکیہ کے ہمراہ اسی گھر میں آئی تھی جہاں آنے کے بعد اس کی زندگی یکسر طور پر تبدیل ہو گئی تھی اب ایک بار پھر وہ یہ سب چھوڑ چھاڑ کر کسی دوسری راہ پر گامزن ہونے چلی تھی۔ نہیں جانتی تھی اب اس کی منزل کہاں ہے مگر شاید منزل تو اسے ابھی تک ملی ہی نہیں تھی اس نے خالی خالی نگاہوں سے پورے گھر پر ایک نظر دوڑائی، سکیہ نے اس کا ضروری سامان سب پیک کر دیا تھا یکدم بھی اس کے دل میں ایک ہو کا سا اٹھا۔

”چاچا۔ چاچا۔“ وہ صوفے سے اٹھ کھڑی ہوئی۔
”کیا ہوا بیٹا کیا بات ہے؟“ چاچا فضل دین بھاگا ہوا اس کے سامنے آن کھڑا ہوا۔

”مجھے اماں کی قبر پر جانا ہے۔“
”آج کتنے سالوں بعد اماں کی قبر پر جانے کی خواہش نے دل میں کروٹ لے کر بے دار ہو گئی۔
”اس وقت۔“ چاچا نے حیرت سے اس کی شکل دیکھی۔

”ابھی تو بیٹا مغرب ہونے والی ہے۔“

”تو اس سے کیا فرق پڑتا ہے؟“

”رات کو اس طرح قبرستان نہیں جانا چاہیے۔“ بیگ کا کام چھوڑ کر سیکنہ نے اسے سمجھانے کی کوشش کی۔

”کچھ نہیں ہوتا آنٹی وہاں قبروں میں موجود لوگ تو خود اتنے بے بس ہوتے ہیں کہ باہر نکل کر اپنے پیاروں کے آنسو صاف کرنے کی استطاعت بھی نہیں رکھتے پھر وہ پجارے ہمیں کیا نقصان پہنچا میں گے۔“
”اماں کی یاد میں اس کا دل دھڑکیں بار کر رہا ہے۔“

”اور پھر میں کراچی جانے سے قبل ایک بار اپنا گھر بھی دیکھنا چاہتی ہوں وہ گھر جہاں میری ایک عمر اپنی اماں کے ساتھ گزری مجھے فاطمہ خالہ اور ام ہے بھی ملنا ہے مجھے وہ گلیاں یاد تھیں ہیں آنٹی جہاں میرا بچپن نہ فون ہے۔“
یاسیت اس کے لہجہ میں گھلی ہوئی تھی۔

”اچھا میں ملک صاحب سے اجازت لے لوں پھر آپ کو لے چلتا ہوں۔“
فضل دین نے اس کے سر پر دست شفقت رکھا اور وہ مطمئن ہو گئی مگر رات انکل کی واپسی کے ساتھ ہی اس کا یہ اطمینان بھی رخصت ہو گیا۔

”نی الحال تو تمہاری یہ خواہش پوری کرنا مشکل ہی نہیں ناممکن بھی ہے۔“

انہوں نے اک نگاہ اس کے ست ہوئے چہرے پر ڈالی۔

”کیوں کہ ہمیں کل گیارہ بجے ایرپورٹ پہنچنا ہے اس سے قبل بہت سارے ایسے کام ہیں جو فضل دین نے پہنچانے ہیں بہر حال زندگی رہی تو میں بہت جلد تمہیں واپس لا کر ان تمام لوگوں سے ضرور ملوانے لے جاؤں گا ابھی تو پرسوں تمہارا ٹیسٹ ہے یونیورسٹی میں داخلے کے لیے۔“
آنٹی سیکنہ نے چونک کر ملک صاحب کی طرف دیکھا۔

”البتہ صبح سویرے سیکنہ کے ساتھ قبرستان ضرور چلی جانا کیونکہ یہ ایک ایسا خواہش ہے جس کے لیے میں

تمہیں منع نہیں کر سکتا۔“

”جی۔“

وہ بمشکل اتنا ہی کہہ سکی۔

مطلب کہ منزل ابھی بھی کہیں دور کھڑی تھی اسے یہاں سے جا کر پھر یونیورسٹی میں داخلہ لینا تھا اور جانے ابھی بھی ایشال اسے اپنا شرف ملاقات بخشا نہیں۔ وہ کچھ نہیں جانتی تھی اور نہ ہی جانتا چاہتی تھی یہ ہی سوچ کر اس نے خود کو حالات کے دھارے پر چھوڑ دیا تھا شاید اسی میں اس کی بہتری تھی۔

☆ (باقی آئندہ شمارے میں ملاحظہ کریں)

نور عین

یکسر خط



”نہیں اماں میں نے پہلے ہی کہہ دیا تھا کہ میں یہ پتلی پھسکی پکی دال نہیں کھاؤں گی بالکل نہیں۔“ عائرہ نے دال سے بھری پلیٹ اور روٹیوں کی چنگیر پیچھے ہٹاتے ہوئے منہ بسور۔

”کھالے عائرہ کیوں میرے لیے آزمائش کھڑی کرتی ہے دیکھ حیرا! کوئی زمیندار نہیں ہے سبزی کی چھوٹی سی دکان ہے اور سے تمہارے بھائیوں کی ذمہ داری اب اتنے بڑے کنبے کے لیے روز روز مرغ مسلم پکنے سے تو رہا تو کچھ بھی کر لے آج تو تجھے اسی دال سے روٹی کھانے پڑے گی۔“ ثوبیہ بیگم نے غصے سے اس کے سر پر ایک پت لگاتے ہوئے کہا۔

”غلطی ہو گئی مجھ سے جو شک کر تیرے گھر آگئی پتا نہیں میری قسمت میں اس گھر کی دیواروں سے سر ٹکراتا کیوں لکھا ہے۔ ورنہ میرے جیسی لڑکیاں تو پاکستان جیسے ملک میں پیدا ہی نہیں ہوتیں وہ تو انگریزوں کے چمچائے دیس کی شہزادیاں ہوتی ہیں جو اپنی مرضی سے آزادی کے ساتھ بڑی شاندار زندگی گزارتی ہیں اور ایک میں ہوں کہ دو کمروں کے ٹوے پھولے مکان میں اپنی مرضی کی چیزیں کھانے کو بھی ترستی ہوں۔“ عائرہ نے بھرائی ہوئی آواز میں شکوہ کیا۔

”ہزاروں سے اچھے ہیں کم از کم دو وقت کی روٹی تو نصیب ہے نا اور دیکھ اپنی چٹنی چڑی پر اتنا غور نہ کیا کر اس نے تو مٹی میں مل جانا ہے۔ صبر شکر سے زندگی گزارے گی تو خود بھی سکھی رہے گی اور ناصر کو بھی سکھی رکھے گی ایک بات یاد رکھنا کبھی رزق کی ناقدری نہ کرنا ورنہ دینے والا اگر غضبناک ہو جائے تو اسی رزق کے پیچھے رول دیتا ہے۔“ ثوبیہ بی بی کا لہجہ دینگ تھا۔

”دیکھ اماں میرے سامنے ناصر کا نام نہ ہی لے وہ صرف میری خالہ کا بیٹا اور تیرا بھانجا ہے نہ تو میں بچپن کی مٹکئی کو مانتی ہوں اور نہ ہی وہ میرے معیار پر پورا اترتا ہے۔“ وہ بے پلے نرم دل سے ناصر کا سراپا اس کی نظروں کے سامنے لہرایا تو وہ ناک چڑھاتے ہوئے غصے سے گویا ہوئی۔

”اپنی بکو اس بند کر عائرہ! کیا کمی ہے ناصر میں اپنا

مکان ہے۔ موٹر سائیکلوں کی ورکشاپ ہے قحقی لڑکا ہے تجھے رانی بنا کر رکھے گا تجھ جیسی بدسلوک لڑکی کے ساتھ اور کسی کا گزارہ ہونا بھی نہیں اب زیادہ ٹر مت کر اور روٹی کھالے۔“ ثوبیہ بی بی نے چنگیر کو عائرہ کی طرف کھسکایا۔

”مجھے اس سے شادی کرنے میں کوئی دلچسپی نہیں بلکہ مجھے پاکستان میں شادی کرنی ہی نہیں ہے۔ میں تو کسی ایسے بندے سے شادی کروں گی جو بڑھا لکھا ہو فر فر انگریزی بولتا ہو اور مجھے بیاہ کر اس شہر بلکہ اس ملک سے ہی دور لے جائے ایسے دیس لے جائے جہاں میرے جیسی شہزادیاں بستی ہوں میری خواہشیں منہ سے نکلنے سے پہلے ہی پوری ہو جائیں۔ میں گھوموں پھوں ناچوں گاؤں بس ٹیش کروں۔ صرف عیش۔“ عائرہ نے آنکھیں میچتے ہوئے چٹخا لیا۔

”دفع ہو تجھے روٹی کھانی ہی نہیں ہے میں ہی پاگل ہوں جو تیری منت کر رہی ہوں۔“ ثوبیہ بی بی نے روٹی اور دال اٹھاتے ہوئے جل کر کہا۔

”اور ہاں جب بھوک لگے تو یہی روٹی کھا لینا یہی روٹی پکا کر آنا ضائع نہ کرنا۔“ ثوبیہ بی بی دروازے کے پاس رک کر عائرہ سے مخاطب ہوئیں جس نے ابھی تک آنکھیں نہیں کھولی تھیں۔ وہ جانتی تھیں کہ دو تین گھنٹے بھوک برداشت کرنے کے بعد عائرہ نے مجبور ہو کر وال سے ہی پیٹ بھرنا ہے۔

”پتا نہیں اس لڑکی کو عقل آئے گی۔“ اپنے سر پر ہاتھ مارتی ہوئیں وہ دروازہ پار کر گئیں۔



”واہ نازو تیری ساس مٹھائی تو بڑی مزے دار لے کر آئی ہیں میں جاتے ہوئے اپنے ساتھ گھر لے کر جاؤں گی۔“ عائرہ نے نرم نرم گلاب جاسن منہ میں ڈالتے ہوئے کہا۔

”ہاں ہاں لے جانا مٹھائی تم سے اچھی تھوڑی ہے بلکہ پھل بھی لے جانا میری ساس پھلوں کا ٹوکرا بھی تو لائی تھیں۔“ نازو نے مسکراتے ہوئے کہا۔

مڑگشت کر رہی تھی لوگوں کا مڑ مڑ کر دیکھنا اور لگا ہوں میں چھپی ستائش اسے ہوا میں اڑانی جا رہی تھی۔
”بیوی فل۔“ وہ دو لمے کو گفٹ دینے کے لیے ذرا سا جھکی جب کوٹ پینٹ پہنے ڈینٹ سے دولہا نے ہو لے سے کہا۔

اس نے بدک کر پیچھے مڑ کر دیکھا لیکن اس کے پیچھے خالی اسٹیج اس کا منہ چڑا رہا تھا یعنی فواد نے اسے ہی مخاطب کیا تھا اس کا سارا جسم ٹھنڈا پڑ گیا سر سائیں سامں کر رہا تھا وہ قدرے کونے میں بیٹھی کرسی کی پشت سے ٹیک لگائے اپنے آپ کو نارمل کرنے کی کوشش کر رہی تھی اس کی دوستوں رشتہ داروں اور بہنوں نے اسے بار بار خوب صورت کہا تھا لیکن دل کبھی ایسے نہیں دھڑکا تھا پھر آج ایسا کیا ہوا کہ وہ کسی خزاں رسیدہ پتے کی مانند کانپتی ہی چلی جا رہی ہے۔

”آپ ٹھیک تو ہیں نا۔“ کنبیر آواز پر اس نے گھبرا کر آنکھیں کھولیں تو فواد پانی کا گلاس لیے اس کے سامنے کھڑا تھا۔

”آپ۔۔۔ لیکن آپ یہاں کیوں آئے سب لوگ کیا سوچیں گے۔“ عازنہ نے اسٹیج کی طرف دیکھتے ہوئے گھبرا کر کہا جہاں سب لوگ اب فوٹو سیشن کروا رہے تھے۔

”لوگ کچھ نہیں کہیں گے آپ غالباً نازو کی سہیلی ہیں مجھے فضا نے بتایا تھا۔“ اس نے اپنی بہن کا نام لیا۔
”یہ لیں پانی پی لیں پھر آرام سے بات کرتے ہیں۔“ فواد کے نرم لہجے پر عازنہ نے جھجکتے ہوئے پانی کا گلاس اٹھا لیا۔

”میں اپنی امی سے بہت اٹھچ ہوئی اسی لیے شادی کا فیصلہ بھی ان پر چھوڑ دیا۔ امی نے مجھے نازو کی تصویر تک نہیں دکھائی آپ کو دیکھا تو سوچا کہ آپ کے ذریعے ان سے پیغام رسائی کی جائے اسی لیے آپ کو مخاطب کر بیٹھا لیکن مجھے کیا پتا تھا کہ آپ میرے ایک لفظ پر یوں بے جاں ہو جائیں گے کیا خوب صورت چروں کو خوب صورت نہیں کہنا چاہیے؟“ اس کا لہجہ سوالیہ تھا۔ ”ویسے بھی آج تو مجھے اپنے سسرال والوں کو

”بھئی میری تو موبیس ہو گئیں اب تو تجھے تھرڈ ایئر میں داخلہ لینے کی کوئی ضرورت نہیں دو ماہ بعد تو تو بیاہ کر کینیڈا چلی جائے گی پھر تو بس پیش کرنا اور خوب گھومنا پھرنا۔ شکر منا کہ تیری جان اس لوڈ شیڈنگ کے عذاب سے چھوٹ جائے گی ویسے اپنی رشتہ والی سے کہنا کہ میرے لیے بھی کوئی ایسا ہی ملک سے باہر سہل بندہ ڈھونڈ دے میرے لیے رشتہ ڈھونڈنا تو آسان ہی ہو گا نا جب تیرے جیسی معمولی شکل و صورت ایک مزدور کی بیٹی کے لیے باہر کا رشتہ مل سکتا ہے تو میرے لیے تو کوئی مشکل ہو ہی نہیں سکتی۔“ آخری بات دل ہی دل میں سوچتے ہوئے اس نے مسکراتے ہوئے اگلا گلاب جامن اٹھایا۔

”ہاں بھئی ہاں تیرے لیے بھی کوئی شہزادہ ڈھونڈ لیتے ہیں لیکن ابھی تو تو منگنی کی رسم کے لیے لڑکے والوں کے گھر جانے کی تیاری کر آخر میری سب سے پکی اور خوب صورت سہیلی بے ذرا لڑکے والوں پر ہمارا رعب بھی تو پڑنا چاہیے نا انہیں بھی تو بتا چکے کہ ہمارے جاننے والوں میں بھی ایک چاند کا لکڑا موخو ہے۔“ عازنہ کے نرم و ملائم بے واع چہرے کو دیکھتے ہوئے نازو نے فخر سے کہا تو غرور سے عازنہ کی گردن میں جیسے کلف لگ گیا۔

”ہاں ہاں کیوں نہیں میں نہیں جاؤں گی تو اور کون جائے گا۔“ عازنہ تصور ہی تصور میں اپنے آپ کو منگنی کے دن نازو کے سرالیوں کی تعریفوں کے ٹوکے وصول کرتے ہوئے دیکھنے لگی بس آٹو گراف دینے کی کمی تھی۔



بلیک شیفون کا سوٹ پہنے جس کے گلے اور بازوؤں پر سلور لیس لگی تھی وہ ہلکے ہلکے میک اپ سمیت تک سٹک سے تیار تھی ریمی بالوں کو ایک سائیڈ سے سلو ہنز لگا کر دو سری سائیڈ پر ایسے ہی کھلا چھوڑ دیا تھا اتنے سے سنگھار سے ہی اس کا روپ لو دینے لگا تھا۔ سلور ہیل والے جوتے پہنے وہ سہولت سے اودھرا دھر

جاننے ان کو سراہنے کا پورا حق ہے۔“ فواد نے اس کے سارے اعتراضات کا جواب ہی دے ڈالا۔

”نہیں اصل میں مجھے امید نہیں تھی کہ آپ مجھے اس طرح مخاطب کریں گے یہاں پاکستان میں ایسی باتوں کو معیوب سمجھا جاتا ہے ویسے بھی میں نے کبھی بھائی اور ابا کے علاوہ کسی مرد سے بات نہیں کی بس اس لیے۔ خیر آپ بتائیں آپ کو نازو سے کیا کہنا ہے اور میں آپ کی مدد کیسے کر سکتی ہوں۔“ عازنہ اب اپنے آپ کو گمبوز کر چکی تھی سو واپس اپنی جون میں آتے ہوئے بولی۔

”آپ انہیں یہ نمبر دے دیجیے گا ان سے کہیے گا کہ رات دس بجے اس نمبر پر کال کر لیں مجھے ان سے ضروری بات کرنی ہے۔“ فواد نے اس کی طرف کانغذا کا ایک ٹکڑا برہماتے ہوئے کہا۔

”ٹھیک ہے اور بتائیں فواد جی آپ کو کھانے میں کیا کیا پسند ہے۔“ عازنہ نے کانغذا کا ٹکڑا بیک میں رکھتے ہوئے سوال کیا۔

باتوں ہی باتوں میں کھانا بھی لگ گیا عازنہ اب اس کے مشاغل کے بارے میں بات کر رہی تھی۔

”Please Give Me a Bread“

فواد نے شستہ لہجے میں عازنہ کے قریب پڑے نان کی جانب اشارہ کیا تو وہ جیسے اس کے لہجے اور الفاظ پر فدا ہی ہو گئی۔

”نہیں نازو کی قسمت میں فواد جیسا فر فر انگریزی بولنے والا شخص ہو ہی نہیں سکتا یہ تو میرے خوابوں کا شہزادہ ہے اور اسے میری تقدیر ہی بننا چاہیے۔“ گھر واپس آتے ہوئے وہ مسکراتے ہوئے سوچتی رہی اور پھر رات کے دس بجے اس کی انگلیوں نے فواد کا دیا ہوا نمبر ڈائل کیا تھا اسے یہ بتانے کے لیے کہ نازو کو اس سے بات کرنے میں کوئی دلچسپی نہیں۔

☆ ☆ ☆

”دنیا میں چمگاڈو کی ایک ایسی قسم پائی جاتی ہے جو سوئے ہوئے انسانوں کو اپنے پروں سے ہوا دے دے

کر دے ہوشی کی نیند سلا دیتی ہے اور جب شکار بے سدھ ہو جاتا ہے تو اس کا خون چوس کر اسے مار ڈالتی ہے۔“

”اف کیسی کیسی خطرناک باتیں سن رہی ہو جلدی جلدی کھیرے کاٹو میری ساس آنے ہی والی ہوں گی ابھی بیٹھے میں کسٹرو بھی تیار کرنا ہے۔“ نازو نے ٹی وی بند کرتے ہوئے سستی سے کھیرے کا ٹی عازنہ کو مخاطب کیا۔

”کھیرے تم کاٹو کسٹرو میں بتا لیتی ہوں۔“ عازنہ نے نازو کو چھری تھمائی۔

”نہیں عازنہ تم رہنے دو پہلے ہی سارا کھانا تم نے تیار کیا ہے اب بیٹھا بھی بناؤ گی تو تھک جاؤ گی تم بیٹھے بیٹھے سلا دینا لو کسٹرو میں بنا لوں ویسے تمہاری اتنی مدد کرنے کا شکریہ ورنہ آج کل کون کسی کے اتنے کام آتا ہے۔“ نازو نے چھری اور پلیٹ اس کی طرف برہمائی۔

”شکریہ و کریہ کہنے کی کوئی ضرورت نہیں اور جب میں نے کہہ دیا کہ کسٹرو میں بناؤں گی تو پھر میں ہی بناؤں گی۔“ عازنہ نے کھڑے ہوئے قدرے رعب دار لہجے میں کہا تو نازو ہنس دی۔

اسی وقت شائستہ بیگم کمرے میں داخل ہوئیں۔

”واہ بھئی واہ لڑکی ہو تو عازنہ جیسے جتنی خوب صورت اتنی ہی خوب سیرت اگر میرا جو اوتا چھوٹا نہ ہوتا تو میں اسے اپنی بہو بنا لیتی۔“ شائستہ بیگم نے عازنہ کو گلے سے لگاتے ہوئے کہا تو وہ فاتحانہ انداز میں مسکرا اٹھی نازو تو جیسے پس منظر میں چلی گئی تھی۔

☆ ☆ ☆

”میں تو چاہتا ہوں کہ ایک لمحے کی بھی دیر نہ ہو اور تم دلہن بن کر میرے گھر آ جاؤ لیکن تم تو جانتی ہو نا کہ میں اپنی امی کی مخالفت نہیں کر سکتا۔ نازو سے منگنی تو میرے گلے کی ہڈی بن گئی ہے جو نہ اٹکتے بنتی ہے نہ اٹکتے۔“ فواد نے جھنجھلاہٹ بھرے انداز میں کہا۔

”آپ شائستہ خالہ سے بات تو کریں وہ تو مجھ سے بہت پیار کرتی ہیں وہ مجھے پسند بھی بہت کرتی ہیں چاہیں تو پوچھ کر دیکھ لیں۔“ عازنہ نے نزاکت سے کہا۔

”رحمت نہیں زحمت ساس تو گھر کا سکون تباہ کرنے والی ڈان ہے ایسی ڈان کو عزت کی نہیں موت کی ضرورت ہوتی ہے۔“ نازو نے چیخ کر کہا۔ اور پھر اگلے پندرہ منٹ یہ بحث زور و شور سے جاری رہی۔



”میں نے تمہیں منگنی پر دیکھا تھا اور اب آج دیکھ رہی ہوں بھی اتنا حسین چہرہ دکھانے میں اتنی کنجوسی کیوں مجھے تو جیسے ہی نازو نے فون کیا کہ فضا آئی ہے میں تو سارے کام چھوڑ چھاڑ کر یہاں آگئی۔“ فضا سے گلے ملتے ہوئے عائرہ نے گرم جوشی سے کہا۔

”ہائے۔ اللہ باجی مذاق تو نہ کریں آپ تو خود اتنی پیاری اتنی سوہنی ہیں پھر بھی اتنے بڑے دل والی ہیں۔“ تحسین لڑکیاں تو اپنے پروں پر پانی بھی نہیں پڑنے دیتیں اور آپ دوسری لڑکیوں کی اتنے گلے دل سے تعریف کر دیتی ہیں کمال ہے۔“ فضا اچھی خاصی متاثر ہو گئی تھی تحسین کہلوانا ہر لڑکی کی کمزوری ہوتی ہے پھر فضا کیسے ٹریپ نہ ہوتی۔

”میں سمو سے مل کر لاتی ہوں تم دونوں باتیں کرو۔“ نازو نے کمرے سے باہر نکلتے ہوئے کہا۔

”ہاں بھی آج کل تمہاری کیا مصروفیات ہیں۔“ عائرہ نے فضا سے سوال کیا۔

”کچھ نہیں باجی چھٹیاں ہیں تو کھانا، پینا، فلمیں گانے دیکھنا اور ڈھیر سارا سونا۔“ فضا نے ایک ہی سانس میں اپنا سارا شیڈول عائرہ کے گوش گزار کر دیا۔

”تمہیں گانے پسند ہیں نا یہ لو میرے موبائل پر گانے سنو میرے پاس بہت اچھی کولیکشن ہے تمہیں بہت مزا آئے گا تم میوزک انجوائے کرو میں ذرا نازو کو دیکھ کر آتی ہوں۔“ کمرے میں داخل ہوتی ہوئی شائستہ بیگم کو سلام کر کے وہ تیزی سے چکن کی جانب بڑھی۔

”مجھے ایسی لڑکی سے اپنے بیٹے کی شادی نہیں کرنی جو سسرال اور ساس کو زحمت سمجھے غضب خدا کا ایسے اوجھے خیالات ہیں اور ان کو ریکارڈ بھی کروا رکھا ہے آپ ہمیں منگنی کا سامان واپس کر دیں آپ کا سامان

”اسی اپنے اصول کی بہت کچی ہیں وہ بتا وجہ کے کبھی منگنی نہیں توڑیں گی چاہے جو بھی ہو جائے ویسے بھی تم خود ہی سوچو ہم لوگوں کو بلا وجہ منگنی توڑنے کا کیا جواز دیں گے ابھی میری چھوٹی بہنوں اور بھائی کی شادیاں ہوتی ہیں ایسے تو میں ان کے راستے کی رکاوٹ بن جاؤں گا۔ کیا تم مجھے منگنی سے پہلے نہیں مل سکتی تھی؟“ نواز نے تیز لہجے میں کہا۔

”اور اگر یہ منگنی ٹوٹنے کی کوئی وجہ بن جائے تو۔“ عائرہ کا انداز عجیب سا اسرار لیے ہوا تھا۔

”منگنی ٹوٹنے کی وجہ پھر تو کمال ہو جائے لیکن یہ سب ہو گا کیسے؟“ نواز کے لہجے میں دوبارہ ساجوش تھا۔

”تو پھر غور سے سنو۔“ اب کے عائرہ کا لہجہ کھٹکنا رہا تھا۔



”نہ لو سارے دلائل میں نے تو شازیہ کو بہت منع کیا تھا مگر اس نے مباہتے میں میرا نام زبردستی لکھ لیا خیر اب جو بھی ہو تیاری تو کرنی ہی ہے نا اس لیے تمہارے پاس چلی آئی آخر کو تم میری کچی سیلی ہو اس مباہتے کی تیاری تم نہیں کرواؤ گی تو اور کون کروائے گا۔“ عائرہ نے من بھرے لہجے میں کہا۔

”ہاں ہاں کیوں نہیں لیکن مجھے بتاؤ تو سہی کہ مجھے کرنا کیا ہے۔“ نازو نے نرم لہجے میں کہا۔

”بحث کا موضوع ہے ”ساس رحمت یا زحمت“ میں اس کے حق میں دلائل دوں گی جبکہ تمہیں ساس کی مخالفت میں دلائل دینا ہوں گے یہ سارے پوائنٹس تمہارے پاس موجود کاغذ پر لکھے ہوئے ہیں بس تم نے انہیں تیز لہجے میں بولنا ہے جیسے دوسری اسٹوڈنٹس بولتی ہیں اور میں ساس کے حق میں بولوں گی۔“ نازو کو ساری تفصیل سمجھا کر اب وہ اس کے مقابل آکھڑی ہوئی موبائل پر ریکارڈنگ کا بٹن دب چکا تھا۔

”ساس تو اللہ کی رحمت ہے گھر کا سکون ہے پھر اسے عزت دینا کیا مشکل ہے۔“ عائرہ نے ابتدا کی۔

آپ تک پہنچ جائے گا۔ ”کمرے سے آئی تیز آوازوں پر نازو اور عاتزہ کمرے میں پہنچیں تو شائستہ بیگم گرج رہی تھیں اور حاجرہ بیگم ہکا بکا ان کی الزام تراشیاں سن رہی تھیں۔

”نہیں عازرہ ہم بھلا بنا دیکھتے بھالے تمہاری شادی کسی اجنبی خاندان میں کیسے کر سکتے ہیں۔ لڑکا کیا ہے۔ کہاں رہتا ہے۔ کیا کرتا ہے۔ اس کی عادتیں کیسی ہیں یہ ساری باتیں جانے اور جانچے بغیر ہم تمہارا ہاتھ کسی کے ہاتھ میں کیسے دے سکتے ہیں اور ویسے بھی جابر بیگم ہماری محلے دار ہیں محلے داری کا لحاظ بھی تو رکھنا ہے۔ اچھا تو نہیں لگتا کہ جہاں سے نازو کو انکار ہوا ہے ہم وہاں تیری شادی کر دیں ویسے حیرت کی بات ہے نازو جیسی پیاری بچی کا رشتہ ٹوٹ کیسے گیا حاجرہ بہن تو کچھ بتاتی ہی نہیں۔“ ثویہ بی بی کا قطعی لہجہ اب ہلکی سی رنجیدگی لیے ہوا تھا۔

”میرا رشتہ خود بخود نہیں ٹوٹا عازرہ نے جان بوجھ کر تڑپایا ہے تو یہ خالہ۔“ جواب دینے کے لیے منہ کھولتی ہوئی عازرہ نازو کی دھماکے دار انٹری پر جہاں کی تہاں خاموش کھڑی رہ گئی۔

”عائزہ نے۔۔۔“ ٹوسہ بی بی نے بے یقینی سے عائزہ کی سمت دیکھا تو وہ ان سے نظریں بھی نہ ملا پائی اب وہ شرمندگی سے نازو کے منہ سے اصل قصہ سن رہی تھیں۔

”اور تو عازرہ دیکھ لیتا تو کبھی خوش نہیں رہے گی عیار انسان کو خوشی بھی غم کے لحاف میں لپیٹ کر دی جاتی ہے، تو بھی تو چمکاوڑ ہے ناعازرہ وہی چمکاوڑ جو اپنے پیروں کی ہوا سے اپنے شکار کو غفلت کی نیند سلا کر اس کا خون چوس لیتی ہے۔ فرق صرف اتنا ہے کہ تو نے میرے اربانوں کا خون چوس لیا ہے آج فواد کا فون آیا تھا مجھے مجھ سے معافی مانگ رہا تھا اس کا کہنا تھا کہ تم دونوں میں اتنی ایڈر اسٹنڈنٹ ہو چکی ہے کہ اب وہ تمہارے علاوہ کسی اور سے شادی نہیں کر سکتا۔

لکھ کر کینڈا ہی شفٹ ہو جاتا ہے اس لیے ابھی سے انگریزی سیکھ لو اچھا رہے گا۔“ عازرہ کالجہ فخر اور غرور سے چور تھا۔

”نہ بھی نہ مجھے کینڈا نہیں جانا میرے سارے دوست یار تو یہاں ہیں میں وہاں جا کر کس کے ساتھ کھیلوں گا۔“ حماد نے ناک پر سے مکھی اڑائی۔

”ارے بے وقوف وہاں کینڈا میں تو کسی دوست یار کی ضرورت ہی نہیں پڑتی اتنی پیاری سڑکیں پارک اور سینے ہیں کہ بس وہ تو جنت ہے جنت ویسے بھی تجھے ابھی کھورا جانا ہے برا ہو گا پڑھے لکھے گاتب ہی جائے گا نا“ عازرہ نے پیار سے اس کے سر پر چپٹ لگائی۔ ”چل چھوڑ یہ سب یہ دیکھ ایسا ہو گا میرا کینڈا۔“ عازرہ نے میگزین کا رخ اس کی طرف کیا تو کچھ دیر کے لیے تو وہ بھی ٹراس میں آگیا۔

جس وقت توبیہ بی بی بڑی سی چادر لپیٹے گھر میں داخل ہوئیں وہ دونوں بہن بھائی ذوق و شوق سے میگزین کی ورق گردانی کر رہے تھے۔

”آہا ماں آگئیں! ماں دیکھو نا کینڈا کتنا پیارا ہے میں بھی کینڈا جاؤں گا“ حماد نے شوق کے عالم میں کہا تو چادر کو تہ لگائی توبیہ بی بی کے ہاتھ رک سے گئے۔

”چپ کر کوئی کہیں نہیں جا رہا تو جافریج سے مجھے ٹھنڈا پانی لا کر دے پیاس سے حلق خشک ہو گیا ہے۔“ توبیہ بی بی نے درشت انداز میں کہا۔

”تو بیٹھ حماد پانی میں لاتی ہوں۔“ عازرہ تیزی سے کھڑی ہوئی۔

”نہیں مجھے تیرے ہاتھ سے پانی جیسی نعمت نہیں لینی جا حماد پانی تو لے کر آ۔“

”اگلے مہینے کی بیس تاریخ کو تیری شادی ہے تیاری کر لے اور ہاں نکاح اسی جمعے ہی ہو گا فواد کو تیرے کاغذات بھی بنوانے ہیں اور میں نے نازو کا رشتہ ناصر سے طے کر دیا ہے اگلے مہینے کی دس تاریخ کو اس کی رخصتی ہے اس سے اپنی غلطی کی معافی مانگ لینا تاکہ تیری زندگی میں دکھ بے سرا نہ کر لیں۔“ گھونٹ گھونٹ پانی پیتی توبیہ بی بی کے لہجے میں تھکن ہی تھکن تھی

اس نے مجھ سے اس بات کو راز رکھنے کا وعدہ لیا ہے اور فکر مت کرو میں تمہاری طرح سچ نہیں ہوں جو ہونے والی دہسن کو بدنامی کے اندھیروں میں دھکیل دوں اس ”انڈر اسٹنڈنگ“ کے بارے میں کسی کو نہیں بتاؤں گی تجھ سے صرف یہ کہنے آئی ہوں کہ میرے حوالے سے اب تمہارے منہ سے کوئی بات نہ نکلے ورنہ پھر میرا منہ نہ کھلنے کی کوئی گارنٹی نہیں۔“ نازو تحکمانہ انداز میں کہتی ہوئی دروازے کی طرف بڑھ گئی۔ اسے پتا تھا کہ اب عازرہ محلے داروں میں اس کی ذات کے بچے ادھیڑنے سے باز آجائے گی اور عازرہ وہ تو ایل خاموش بھی جیسے گوئی ہو۔

”انڈر اسٹنڈنگ مطلب اس کا منگیتر تجھ سے رابطے میں تھا۔“ توبیہ بی بی کی سرسراتی ہوئی آواز صدمے سے چور بھی اب اس میں قائل کرنے کے لیے عازرہ کو کچھ نہیں کرنا پڑے گا کرے سے باہر نکلتی توبیہ بیگم کے ست قدم اسے بتا چکے تھے۔



”Please Give Me a Water“ میگزین کے چکنے صفحے پر کینڈا کے دلکش مناظر دیکھتی ہوئی وہ حماد سے مخاطب ہوئی جو اس کے قریب ہی بیٹھ ہی پر بیٹھا اسکول کا کام کر رہا تھا۔

”آپ نے مجھ سے کچھ کہا“ حماد نے چونک کر سر اٹھایا۔

”ہاں بھی تم سے ہی کہا تھا۔ میں نے کہا تھا کہ مجھے ایک گلاس پانی دے دو۔“ عازرہ نے کہا۔

”نہیں آپ نے کچھ اور کہا تھا“ حماد نے سر کھجایا۔

”لو کہیں کے میں نے یہی کہا تھا لیکن انگلش میں کہا تھا تمہیں تو پتا ہے تاکہ تمہاری بہن اب انگریزوں کے ملک چلی جائے گی اب وہاں اردو میں تو بات نہیں ہو سکتی نا انگریزی میں گٹ پٹ کروں گی تو بات بنے گی اسی لیے میں نے سوچا ہے کہ تم سے انگریزی میں بات کیا کروں میری بھی پریکٹس ہو جائے گی اور تمہاری انگریزی بھی اچھی ہو جائے گی“ آخر تمہیں بھی تو پڑھ

آخر عازرہ ان کی اپنی بیٹی تھی لاکھ ناراضی سہی وہ دل سے تو یہی چاہتی تھیں تاکہ اس کی زندگی میں کبھی کوئی غم نہ آئے۔

”ماشاء اللہ ماشاء اللہ میری بہو تو چاند کا ٹکڑا ہے لا تو ذرا تیری نظر اتار دوں۔“ شائستہ بیگم نے اس کے اوپر سے لال مرچیں دارتے ہوئے کہا۔

”ماں میں بھی آپ کا بیٹا ہوں اور خوب صورت بھی ہوں بہو کے آنے سے تو آپ مجھے بھول ہی گئی ہیں۔“ عازرہ کے بچے سنورے روپ کو دیکھتے ہوئے فواد نے ماں سے شکوہ کیا۔

”ارے کیسی باتیں کر رہا ہے ادھر آتیری نظر بھی اتار دوں اور ہاں ذرا جلدی آجانا ابھی بہو کے جوتے اور زیورات کی پیکنگ کرنی ہے اور فواد یاد آیا باہر جاتے ہی تم نے مجھے چار لاکھ روپیہ بھجواتا ہے۔ شاوی پر قرض لیا تھا تب ہی تو اتنی دھوم دھام سے شاوی ہوئی میں وہ قرض اتار لوں پھر فضا کے لیے جیڑا کٹھا کرنا ہے۔“

پتر عازرہ اپنی ماں کو میرا سلام کہنا اس سے کہنا کسی دن ہمارے گھر کا چکر بھی لگالے برسوں تم نے کینیڈا چلے جانا ہے پھر تو ملاقات کے لیے کوئی بہانہ بھی نہیں رہ جاتا۔“ شائستہ بیگم نے فواد کے سر سے مرچیں دارتے ہوئے کہا۔

”تو نے تو نازو سے معافی بھی نہیں مانگی حالانکہ تجھے کتنا سمجھایا تھا خیر اللہ نے اس کے نصیب بھی بڑے اچھے جگائے ہیں ناصر نے اسلام آباد میں دکان خرید لی ہے اب وہ سبھی اسلام آباد شفٹ ہو رہے ہیں میں نے تیری طرف سے معافی مانگی تھی اس نے ہنستے ہوئے مجھے گلے لگا لیا وہ بہت خوش ہے بہت خوش۔“ ثوبیہ بی بی دل سے مطمئن تھیں۔

”اوہو اماں تو کیا نازو نازو کرتی جا رہی ہے فواد نے اس سے معافی مانگ تولی تھی ویسے بھی فواد جیسا انسان میرے جیسی فیشن ایبل اور پڑھی لکھی لڑکی کے ہی

قابل تھا اس کا میرا جوڑ تھا تو یہ سب کچھ ہوانا۔ تو مجھے یہ بتا کہ کھانے میں کیا بنانا ہے۔“ عازرہ نے لاڈ سے پوچھا۔

”مرغی بنائی ہے اور دہی بھلے بھی ہیں کہو تو روٹی ڈال دوں۔“ ثوبیہ بی بی کھڑے ہوتے ہوئے بولیں۔

”ویکم تو کینیڈا فواد! یہ بھابھی جی ہیں ناپر نام بھابھی جی۔“ گھنی داڑھی مونچھ والے آدمی نے اس کے سامنے دونوں ہاتھ باندھ کر کہا وہ تھوڑا ڈر کر فواد کے لمبے چوڑے وجود کی اوٹ میں ہو گئی۔

”ڈرو نہیں عازرہ یہ بھاسکبھیر ہیں ہمارے ساتھ گھر شیر کرتے ہیں سگھ ہیں اور بہت اچھے بھی ہیں یہاں کینیڈا میں ہمیں اکٹھے رہتے کئی سال ہو گئے ہیں ان کی دو بیارے پیارے بچے بھی ہیں ابھی تو بھابھی اور بچے چھٹیاں منانے بھابھی کی بہن کی طرف گئے ہیں وہ آئیں گے تو تمہیں ملوادوں گا تمہیں یقیناً اچھا لگے گا۔“ فواد نے تفصیل سے سمجھایا تو اس نے

جھجکتے ہوئے آواب کہا۔ بھاسکبھیر انہیں ٹیکسی میں بٹھا کر خود واپس چاہکے تھے ٹیکسی میں بیٹھتے ہی وہ جیسے چالی سے بولنے والی لڑیا بن گئی۔

”ہائے اللہ جی یہاں کی سڑکیں کتنی پیاری ہیں۔“ اف اللہ عمارتیں تو دیکھیں کتنی بڑی بڑی ہیں۔ ہائے فواد میں بھی ان گروپوں کی طرح پینٹ شرٹ پہنا کروں گی۔“ عازرہ کا جوش ٹیکسی کی رفتار کے ساتھ بڑھتا ہی جا رہا تھا اور فواد وہ مسکرا مسکرا کر اس کی باتوں کے جواب میں بس سر ہلائے جا رہا تھا کہ وہ اسے بولنے کا موقع ہی کمال دے رہی تھی۔

بڑی سہولت سے کٹے تھے۔



”لو بھئی عازرہ تیار ہو جاؤ آج ہم نے کام پر جانا ہے میں نے تمہاری نوکری کی بات کر لی ہے۔“ اس دن فواد صبح منہ اندھیرے ہی گھر سے باہر نکل گیا تھا اور اب خوشی خوشی چابی جھلانا گھر میں داخل ہوا۔

”سچ نوکری مل بھی گئی وہاں پاکستان میں تو بڑی بے روزگاری ہے۔ M-A پاس لوگ بھی نوکری کے لیے جوتیاں چٹاتے رہتے ہیں مان گئی میں فواد کینڈا واقعی کینڈا ہے۔“ عازرہ تیزی سے کھڑی ہوتے ہوئے بولی اور پھر پھر پی سے ناشتا کرنے اور کپڑے بدل کر ہلکا ہلکا میک اپ کرنے کے بعد وہ بالکل تیار تھی۔

”عازرہ تم نے اتنے نئے کپڑے کام پر جانے کے لیے پہن لیے۔“ گھر کے دروازے کو لاٹک کرتے ہوئے فواد نے ہولے سے کہا۔

”ہاہائے تو کام پر رانے کپڑے پہن کر جاتی آپ بھی نا عجیب سی باتیں کرتے ہیں۔“ عازرہ نے ماتھے پر ہولے سے ہاتھ مارتے ہوئے کہا۔

”ممنے کی بات یہ ہے کہ ہمیں کام پر جانے کے لیے ٹیکسی یا بس کا استعمال نہیں کرنا پڑے گا یونہی ہنستے کھیتے باتیں کرتے کام پر چلے جایا کریں گے۔“ فواد نے پیٹ کی جیبوں میں ہاتھ ڈالتے ہوئے اس کی بات کو نظر انداز کرتے ہوئے کہا۔

”یہ تو بڑی اچھی بات ہے۔ ویسے دوپہر کو کھانے میں کیا بناؤں۔“ عازرہ نے مسکراتے ہوئے سوال کیا۔

”دوپہر کا کھانا تو کام کرنے کے دوران وہی لوگ دے دیتے ہیں۔“ فواد نے اپنے پاؤں میں پڑے پتھر کو ٹھوکر ماری۔

”تو پھر رات کو کھانے میں کیا بنے گا۔“ عازرہ نے ایک نیا سوال کیا۔

”آج بھلا کبھی بھی واپس آرہے ہیں شاید بھابھی ہمارے لیے کچھ بنا کر رکھ جائیں۔“ فواد نے اس کی طرف دیکھ کر جواب دیا۔

گھر تک پہنچنے سے پہلے اس کی آنکھوں نے ڈھیروں سینے بن لیے تھے اور اسی کا محل گھر پہنچتے ہی دھڑام سے ڈھے گیا تھا۔

”یہ ہمارا گھر ہے“ فواد نے دروازہ کھولا تو وہ مٹھی میں بھنے دل کے ساتھ اندر داخل ہوئی۔ وہ گھر تو نہیں تھا وہ تو شاید مرغیوں کا کوئی ڈربا تھا جسے لمبائی چوڑائی اور اونچائی میں تھوڑا برعباد کیا گیا تھا ایک سائڈ پر پکن کاؤنٹر تھا اور ایک کونے میں بڑا سائڈرٹس ایک طرف چھوٹا سا الٹیچ بائو تھا اور بس میٹرس کے اوپر لگی لکڑی کی دو برہوں میں سے ایک پر فواد نے سارا سامان رکھ دیا دوسری پہلے ہی سامان سے بھری ہوئی تھی۔

”اؤ نا عازرہ یہ ہمارا گھر ہے اور تمہیں اس کو بسانا ہے۔ تم فریش ہو جاؤ میں کھانے کے لیے کچھ لے کر آتا ہوں۔“ عازرہ کی دلی کیفیت اور دل میں اٹھتے سوالات سے بے خبر وہ نارمل سے انداز میں بولتا ہوا باہر نکل گیا اور پھر عازرہ کے سوالات کا اس نے بڑی مدلل طریقے سے جواب دیا تھا۔

”میں نے کب کہا تھا کہ میں کینڈا میں کوئی بڑا کام کرتا ہوں، محنت مزدوری کرتا ہوں یہ ناجائز تو نہیں ہے اور پھر اپنے زور بازو سے میں اتنا کما لیتا ہوں کہ مجھے کسی کے سامنے ہاتھ نہیں پھیلاتا پڑتا ہے یہاں پر اس سے اچھی رہائش گاہ میں انور ڈی نہیں کر سکتا ابھی شادی پر لیا ہوا قرض اتارنا ہے فضا کی شادی کرنی ہے پاکستان میں پورے گھر کو نئے سرے سے بنانا ہے جب یہ سب ذمہ داریاں پوری ہو جائیں گی تو پھر تمہیں خوب عیش کرواؤں گا لیکن اس کے لیے تمہیں آٹھ دس سال انتظار کرنا پڑے گا ویسے اگر تم چاہو اور میرا ساتھ دو تو یہ ساری ذمہ داریاں دو تین سالوں میں بھی پوری ہو سکتی ہیں۔“

فواد نے اس کو بہتر مستقبل کا خواب اور راستہ دونوں ہی دکھا ڈالے تھے اور وہ اس خواب کو سچ کرنے کے لیے اس کا ساتھ دینے پر تیار ہو گئی لیکن وہ کیا کرے گی اس کا فیصلہ اس نے فواید پر چھوڑ دیا تھا اور پھر اگلے دو دن مستقبل کی پلاننگ کرتے گھومتے پھرتے

”بنا کر رکھ جائیں لیکن انہیں کہاں جانا ہے۔“
 عازرہ نے حیرت سے پوچھا۔
 ”بھاسکبھور اور ان کی بیگم وہیں قریب کے اسکول کی صفائی ستھرائی کا کام کرتے ہیں شام چار بجے سے رات دس بجے تک ان کی ڈیوٹی ہوتی ہے ان کے بچے بھی وہیں پڑھتے ہیں رات کو وہ وہیں اسکول میں ہی سو جاتے ہیں پرنسپل نے خصوصی اجازت دی ہے۔ صبح دس بجے وہ گھر آ جاتے ہیں شام کو چار بجے پھر سے کام پر چلے جاتے ہیں۔“ فواد نے اسے تفصیل سے ساری بات سمجھائی۔
 ”پھر تو ہمارا ان سے آنا سامنا ہی نہیں ہو گا ایسی صورت حال میں وہ ہمارا رات کا کھانا ہم تک کیسے پہنچائیں گے گھر بھی لاکھ ہے اور چالی بھی ہمارے پاس ہے۔“ عازرہ نے حیرانی سے پوچھا وہ بھاسکبھور کو فواد کا بیوی سمجھ رہی تھی۔
 ”ارے بھئی گھر کی ایک چالی مسکبھور بھاسکبھور کے پاس بھی تو ہے آخر وہ گھر ان کا بھی تو ہے۔“ فواد نے گویا دھماکا کیا۔
 ”ان کا گھر کیا مطلب۔“ عازرہ اب کے رک کر بولی۔
 ”بھئی مطلب تو صاف ہے صبح دس بجے سے شام چار بجے تک وہ گھر ان کا ہوتا ہے میں ان سے کرایے کا میسر احصہ وصول کرتا ہوں یہاں پر بھی لوگ ایسے رہتے ہیں ویسے بھی ہم لوگوں نے شام پانچ بجے ہی گھر جانا ہوتا ہے دیکھا جائے تو ہم فائدے میں جا رہے ہیں میں شاید تمہیں پہلے بتانا بھول گیا۔“ فواد کا انداز ہلکا پھلکا تھا جبکہ عازرہ کا چہرہ کورے لٹھے کی طرح سفید ہو چکا تھا اس کا گھر جسے اس نے بڑی مشکل سے اپنا تسلیم کیا تھا وہ بھی اپنا نہیں تھا اس گھر کو کوئی اور بھی شیر کر رہا ہے یہ تصور ہی اس کے دل کو عجیب سی تنگی سے روشناس کروا رہا تھا۔ اس کا مقدر اسے کہاں لے کر جا رہا تھا شدید صدمے کے زیر اثر وہ بتا کوئی سوال جواب کیسے اس کے ساتھ چل دی۔
 ”جاوید بھائی یہ میری بیوی ہے اسے بھی جھاڑو

دے دیں میں اسے کام سمجھا دیتا ہوں۔“ لال رنگ کی چھوٹی سی جیکٹ پہنتے ہوئے وہ اپنے سامنے کھڑے کرخت سے شکل والے آدمی سے بولا وہ دونوں میاں بیوی اس وقت ایک کیبن نما کمرے میں کھڑے تھے جہاں ہر طرف جھاڑو ہی جھاڑو بڑے تھے اور دیواروں پر دیسی ہی لال رنگ کی جیکٹیں لٹکی تھیں جیسے فواد نے اس وقت پس رکھی تھی۔
 ”جھج۔۔ جھاڑو لیکن جھاڑو کا نوکری سے کیا لینا دینا آپ چلیں جلدی کریں ہمیں کام سے دیر ہو رہی ہے مذاق پھر کسی دن کریجیے گا۔“ عازرہ تیزی سے اس کا بازو کھینچتی ہوئی بولی۔
 ”ہمیں یہی کام کرنا ہے عازرہ میں برسوں سے ان سڑکوں پر جھاڑو پھیر رہا ہوں یہ پاکستان اور انڈین لوگوں کی کیونٹی ہے یہ لوگ اچھے خاصے میسے بھی دے دیتے ہیں جو تنخواہ کے علاوہ ہوتے ہیں اور کھانا بھی اور اگر تبھی انہیں کوئی ذاتی کام پڑ جائے پھر تو موج ہو جاتی ہے اتنے میسے ملتے ہیں کہ تنخواہ کم لگنے لگتی ہے۔ اب فواد کیبن کے باہر کھڑا عازرہ کو سمجھا رہا تھا۔
 ”آب یہاں جھاڑو لگانے کا کام کرتے ہیں آپ نے مجھے پہلے کیوں نہیں بتایا اتنا غلط کام۔“ عازرہ بولتے بولتے سانس لینے کے لیے رکی۔
 ”لیکن میں یہ کام نہیں کروں گی بڑھی لکھی ہوں کوئی باعزت کام بھی کر سکتی ہوں لیکن یہ کام نہیں۔ بالکل نہیں۔“
 ”پانچ جماعتیں پاس انسان کو کسی دفتر میں تو کام ملنے سے رہا اور میں یہ کام کر کے پاکستانی ایکسپریس گریڈ کے افسر سے بھی اچھا کما لیتا ہوں اور یہ کوئی غلط کام نہیں ہے یہ کون سا پاکستانی سڑکیں ہیں جو دھول مٹی اڑاتی ہیں بس جھاڑو دکھانے کی دیر ہوئی ہے اور سڑکیں شیشے کی طرح چمکنے لگتی ہیں۔
 ویسے بھی تم نے خود مجھے اپنی طرف متوجہ کیا تھا تمہیں میرے کام سے مطلب ہے یا مجھ سے۔ ابھی بھی دیر نہیں ہوئی اگر تمہیں میرا ساتھ قبول نہیں تو میں تمہیں ابھی آزاد کر دیتا ہوں۔“ فواد کے چہرے پر

نفسے کے رنگ بڑے واضح تھے۔

”نہیں۔ میں نے ایسا کب کہا مجھے آزادی نہیں چاہیے بس مجھے یہ کام نہیں کرنا میں کچھ اور کر لوں گی۔“ عازنہ نے دہل کر کہا جانتی تھی کہ اپنی مرضی کی شادی کر کے وہ اپنے میکے میں ناراض ہو کر جانے کا راستہ مسدود کر چکی ہے۔

”تم جیسی خوب صورت بیوی کو اکیلے کسی کام پر بھیجنا خود ایک بڑی مصیبت ہے یہ کھلا ڈلا معاشرہ تمہیں کہیں کا نہیں رہنے دے گا کام تو تمہیں یہ ہی کرنا ہو گا یہ لوجیکٹ پہنچاؤ پکڑو اور شروع ہو جاؤ میں ذرا دوسری کالونی کو صاف کر آؤں اور ہاں کام کو دل سے اور دیانت داری سے کرو تو ہر کام بڑا ہوتا ہے۔“ فواد نے اس کو جھاڑو اور جیکٹ تھماتے ہوئے آخری بات قدرے نرمی سے کہی تھی۔

اچھکسیوزی کی آواز پر سڑک پر جھاڑو لگاتی عازنہ نے مڑ کر دیکھا وہ شاید کوئی آئینہ خانہ تھی جو اسے پکار رہی تھی اس کے گلے میں منگل سوتر تھا۔

”جی فرمائیے۔“ عازنہ نے تھکے تھکے انداز میں پوچھا۔

”مجھے گھر پر کچھ کام ہے تم کرو گی۔“ خاتون نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔

”اے لڑکی کیا سوچنے لگیں اگر کام نہیں کرنا تو بتادوں۔ میں کسی اور سے کروالوں گی ویسے سوچ لو میں تمہیں دس ڈالروں کی اور کھانا بھی ملے گا۔“ خاتون نے ادھر ادھر دیکھتے ہوئے پیشکش کی۔

”کھانا۔“ عازنہ کو اچانک بھوک کے شدید احساس نے دبوچا تھا اگلے ہی لمحے وہ اپنا جھاڑو اٹھائے جانے کے لیے تیار تھی۔

please give me a bread

”Madam

وہ اندر جانے کو تھی جب اس جیسی لال جیکٹ پہنے ایک لڑکا وہاں آپہنچا۔

”Ok please wait“ وہ خاتون لڑکے کی بات کا جواب دیتے ہوئے عازنہ کو گھر کے اندر لے آئی وہ لڑکا

شاید ان کا مستقل خدمت گزار تھا۔

”یہاں پر تو سبھی ایسے ہی بات کرتے ہیں۔ اور میں سمجھی نہ جانے فواد کتنا پڑھا لکھا ہے۔“ اپنی عقل پر ماتم کرتے ہوئے وہ گھر میں داخل ہوئی تو کام کی نوعیت جان کر اسے دھچکا لگا تھا اسے واش روم صاف کرنا تھا اپنے گھر میں اس نے کبھی واش روم صاف نہیں کیا تھا اور یہاں غیروں کے لیے اتنا غلیظ کام کرنا پڑ رہا تھا اس کا دل تو چاہ رہا تھا کہ صاف انکار کر کے پلٹ جائے لیکن پیٹ کی بھوک بڑی ظالم چیز ہے سو مٹلاتے ہوئے دل اور لرزاتے ہوئے ہاتھوں کے ساتھ اس نے بڑی دقتوں سے مشکل کا یہ پہاڑ عبور کیا اور سارا وقت اپنی قسمت کو کوستی رہی اور جب ایک گھنٹے بعد وہ گھر سے باہر نکلی تو اس کے ہاتھ میں ایک ٹوٹی پھوٹی کٹوری تھی جس میں پکلی تیلی بے رنگ وال بھری تھی بھلا جمعہ دنوں کو کوئی گھر کے ٹیبل پر کھانا تھوڑی دیرتا ہے وہ بے صبری سے وہیں بیٹھیوں پر بیٹھ گئی اور اپنے ہاتھ میں دلی روٹی کو دال میں ڈبو ڈبو کر کھانے لگی۔

ابھی چار پانچ نوالے ہی حلق سے اترے تھے جب اس کا نوالے سے بھرا ہاتھ منہ تک جاتے جاتے رک گیا۔

یہ تو وہی دال ہے جسے کھانا وہ پسند نہیں کرتی تھی اور اب اپنی ذلت بھری روٹی اور وہ بھی اسی دال کے ساتھ اسے یقین ہی نہیں آ رہا تھا۔

”نہیں نازو میں چمگاڑ نہیں۔ بالکل نہیں ہوں بھلا میں وہ انوکھی چمگاڑ ہو بھی کیسے سکتی ہوں وہ چمگاڑ تو میرا لالچ تھا جس نے پہلے مجھے سہانے خوابوں کی ٹھنڈی ہوا سے مدھوش کر دیا اتنا مدھوش کہ میں اچھے برے کی تمیز ہی کھو بیٹھی اور جب میں غفلت کی نیند سو گئی تو میری عزت نفس اور وقار کا خون پی ڈالا اس لالچ نے مجھے اپنے والدین کو پکارنے کے قابل بھی نہیں چھوڑا خواب بھری آنکھوں کے لالچ کی خطرناک چمگاڑیوں ہی سارے راستے مسدود کر دیا کرتی ہے تم ہی بتاؤ نازو چمگاڑ کون ہے؟ میں یا میرا لالچ۔“ زیر لب برہناتے ہوئے وہ پھوٹ پھوٹ کر رو دی۔



بے فکر چہرے، پر فکر چہرے، جھنجلائے چہرے، مسکرائے چہرے کوئی بے زار کوئی خوش باش صورت، کوئی گھبرایا، کوئی مطمئن سا، کوئی تھکا ہوا تو کوئی تازہ دم، بے نیاز لوگوں کا، جو تمہارے ارد گرد اور وہ میرے ساتھ تھی کبھی میرے ہم قدم کبھی میرے آگے کبھی میرے پیچھے حسب عادت پیڑ پیڑ زبان چل رہی تھی کبھی اس کی آواز میرے کانوں کے پردے پھاڑنے لگتی تو کبھی مدھم ہو جاتی۔

”تم اپنی زبان تالو سے لگا کر نہیں چل سکتیں۔“ میں اس کے بے تکان بولنے پر چڑ گیا تھا اس پاس سے گزرتے لوگ بھی اس کی اوچی آواز کے باعث ہمارے طرف متوجہ ہوتے میں بے زار ہو رہا تھا اکتا کر اسے ڈیٹ دیا۔

وہ ایک ساعت کو چپ ہوئی پھر کھل کھل کر ہنسی۔
”بھڑ میں، بے ہنگم شور اور اس کی کھنٹی جوڑیوں سی ہنسی، بے ساختہ کئی گردنیں ہماری جانب گھومی تھیں اور بے اختیار میرا دل چاہا تھا اس بد تمیز لڑکی کو ایک ہاتھ رسد کر دوں۔“

”ہنس کیوں رہی ہو پاگل ہو گئی ہو کیا؟“ میری بے زاریت نقطہ عروج تک جا پہنچی تھی۔ اس نے بمشکل تمام اپنی ہنسی پر قابو پایا تھا۔ جگر جگر کرتی آنکھیں، سرخ پڑتے عارض اور گہرے بھنور مجھے اس سے نظر چراتا پڑی، ہنستی ہوئی وہ اتنی پیاری لگتی تھی کہ میں ناچا ہتے ہوئے بھی نظر پھیر لیتا اس ڈر سے کہ میں اسے میری نظر ہی نہ لگ جائے۔

میں غصے سے تن فن کرتا تیزی سے دو چار قدم آگے پیڑ گیا۔ جب مڑ کر دیکھا تھا تو وہ میرے ساتھ نہیں تھی۔

میرا دل دھک سے رہ گیا وہ بے نیاز لڑکے تھے بے انتہا بھڑ اور ان میں وہ کہیں کھو گئی تھی۔ میں دیوانہ وار پاتا تھا۔ لوگوں کو دھکیلتا، جم غفیر چیرتا، ادھر ادھر دیکھتے ہوئے دل دھڑ دھڑ کیے جا رہا تھا۔ اس کے کھو جانے کا تصور ہی سوہان روح تھا۔ جو میری رگوں سے جان نکال رہا تھا اک لمحہ میں ہی میری حالت دگرگوں ہو گئی تھی قبل اس کے کہ میں چیخ اٹھتا وہ اک اسٹال پر کھڑی نظر آئی تھی۔

”اوہ گاڈ۔“ اسے دیکھتے ہی میری رکتی سانس بحال ہوئی، رگوں میں جمنا خون پھر سے دوڑنے لگا میں نے لپک کر اس کا بازو جکڑ لیا تھا۔

”کیا ہوا؟“ اس کی صورت ویسی ہی بے فکر اور بر سکون تھی جبکہ میرے چہرے کی رنگت یقیناً ”اڑ پکی تھی جسے اس نے بھی محسوس کیا بھی مسکراتی نظریں مجھ پر مرکوز کیے مختصر سوال کیا تو میں اپنے حواس یکجا کرتے بے ساختہ اس خوف کا اظہار کر گیا۔

”اتنا رش ہے بلینڈینا میرے ساتھ رہو، خدا ناخواستہ تم کھو گئیں تو پتا ہے ابھی ایک پل میں کیا قیامت گزر گئی مجھ پر میں تو سمجھا کہ تم۔“

”اوہو تم سمجھے کہ میں اس رش کی نذر ہو گئی کمال کرتے ہو حدید، اتنی ہی پچی ہوں تائیں کہ اس بھڑ میں کھو جاؤں گی اور تمہیں پتا بھی نہیں چلے گا۔ ارے بابا اچھی خاصی سمجھدار ہوں اگر یہاں تم سے بچھڑ بھی گئی نا تو گھر تک با آسانی پہنچ جاؤں گی اپنا شرے، سارے راستے میرے دیکھے بھالے ہیں۔ تم بالکل فکر نہ کرو۔ اور ادھر توجہ کرو مجھے یہ سوٹ لے دو دیکھو تو کتنا پیارا ہے۔“ وہ بڑے اطمینان سے کہہ رہی تھی اور میں چلا

”اف خدا! مزید ایک سوٹ اور اب بس کرو میری جیب کی دشمن۔“

”لے دو نا پلیز۔“ وہ جس ادا سے بولی۔
میں بس اسے تکتا رہ گیا تھا۔

”اوئے ہیرو کدھر گم ہے؟“ ایک زوردار ہاتھ میرے شانے پر پڑا تھا اور سارا طلسم ٹوٹ گیا تھا ہجوم میرے آس پاس جوں کا توں تھا مگر وہ کہیں نہیں آئی میں نے بے طرح جھنجھلاتے ہوئے پلٹ کر دیکھا۔ ہارن کی کتائی صورت نگاہوں کے سامنے تھی۔ دھاتھے

پر بل ڈالے مجھے گھور رہا تھا۔
”اوئے آخر مسئلہ کیا ہے تیرے ساتھ؟ یہ تو چلنے



چلتے کہاں گم ہو جاتا ہے؟ کوئی چوتھی بار مراقبے میں گیا ہے تو دیکھ بندے داپتر بن کے چل، نظر نہیں آ رہا کتنا رش ہے یہاں، اگر تو ادھر ادھر ہو گیا تو کہاں ڈھونڈتا پھوں گا تجھے پہلے ہی میرا مغز پختی ہو رہا ہے کم از کم تو تو مجھے تنگ نہ کر۔“ اس نے زور سے میری شرٹ کا کالر کھینچا۔

میں نے ناگواری سے اسے دیکھتے کالر آزاد کروایا اور بھنا کر بولا۔

”تو میری فکر نہ کر میں کوئی دودھ پیتا بچہ نہیں ہوں کہ ادھر ادھر ہو گیا تو تجھے ملوں گا نہیں۔ چار برس سے اوپر کا عرصہ ہو گیا ہے مجھے اس دیار میں آئے سارے راستے جانا ہوں، بہت اچھی طرح واقف ہو گیا ہوں یہاں کی سڑکوں سے اور یہاں کے بندوں کی بھی پہچان ہے کسی کے ہتھے نہیں چڑھوں گا اور میری جان تو میرے بجائے اپنی مریانہ کا خیال رکھ، جو تھوڑی باؤلی بھی ہے اگر اس نے تجھے نہ پا کر بھال بھال کرنا شروع کر دیا تو پورا شہر ہلادے گی۔“

”اے ہاں مریانہ! کہاں گئیں ابھی تو میرے ساتھ تھیں۔“ میرے کہنے پر وہ یکدم بوکھلا کر دائیں بائیں دیکھنے لگا وہ تینوں ہمارے پیچھے ہی چل رہی تھیں میں نے مڑتے ہوئے انہیں جیولری شاپ میں گھستے دیکھ لیا تھا۔ ہارون مجھ پر گرم ہو رہا تھا اس لیے اس بات سے بے خبر تھا اور اب چشم زدن میں اس کا چہرہ فاق ہوا تو میں نے لبوں پر اٹھ آنسو والی مسکراہٹ بمشکل روکی۔

”اے ہیرو کہاں گئیں یہ تینوں؟“ وہ ہونٹوں کی طرح اچک اچک کر انہیں تلاش کرنے لگا وہ پل میں گھبرا گیا تھا مجھے اس کی یہ کیفیت کھلکھلانے پر مجبور کر رہی تھی مگر خود پر قابو کیے رہا کچھ دیر اس کی حالت سے لطف لینے کے بعد میں نے اس کے دونوں شانے پکڑے اور پورا کا پورا اگھما کر جیولری شاپ کی گلاس وال کی جانب ہٹا دیا۔

”درا ادھر تھو نا ہونق صاحب۔“

”وہ!“ اندر نظر پڑتے ہی اس نے بے اختیار گہرا سانس لیا۔

”یار جان نکال دی تھی میری توبہ ہے، بڑا خوار کرتی ہیں یہ لڑکیاں اب دیکھ چار گھنٹوں سے یہاں پریڈ کروا رہی ہیں اور ابھی تک ان کی خریداری مکمل نہیں ہوئی۔ پتا نہیں کس طرح کی چیز چاہیے ہوئی ہے انہیں، ایک جوتی بھی خریدنا ہوئی ہے تو دس دکانوں کے پھیرے لگائیں گی پھر نہیں جا کر شراویوں کو کوئی جوتی پسند آئے گی۔ حد ہوئی ہے کسی بات کی، میرے جیسا بندہ اتنی دیر میں آدھا شر خرید لے۔ جتنی دیر میں ان سے تین انچ کی لسٹ کے مطابق اشیاء نہیں خریدی گئیں چل کر دیکھیں تو اب کن سا جھمکا بندہ رہ گیا ہے جس کے لیے یہ ادھر گئی ہیں۔“ وہ سخت عاجز آیا ہوا تھا منہ بگاڑے بولتا ہوا مجھے بازو سے پکڑے گلاس ڈور کھولتا اندر گھس گیا۔ میں لڑکھاتا اس کے پیچھے تھا ہمارے اس بد تہذیب داخلے پر شاپ کیپر نے انتہائی چوکس ہو کر ہمیں گھورا۔ تو ہم دونوں نے ہی جھٹ ہونٹ پھیلا کر فرشی سلام جھاڑ دیا۔

”ہاں بھی اب اور کیا کیا خریدنا ہے تم لوگوں نے؟“ ہارون باجھیں کانوں سے لگا کر مریانہ کے پیچھے جا کھڑا ہوا۔

”ہم نے تو اپنی شاپنگ مکمل کر لی ہے ہارون بھائی بس یہ مریانہ ہی کو کچھ چاہیے۔“ نوین اپنے شاپنگ بیگز سنبھالتی خاصی تھکی تھکی سی لگ رہی تھی۔ افزا بھی بے زاری کاؤنٹر پر کہنی ٹکائے کھڑی تھی، البتہ مریانہ کا چہرہ پر جوتی تھا اور وہ پورے استیاق سے جیولری دیکھ رہی تھی۔

”ہائے اللہ کتنی ڈھیر ساری چوڑیاں ہیں اور کتنی پیاری پیاری، اف میرا تو دل چاہ رہا ہے یہ ساری کی ساری چوڑیاں خرید لوں۔“ میری نگاہوں میں اس نے کی موہنی صورت کھوم گئی۔

وہ دیوانی چوڑیاں دیکھتے ہی ایسے ہی جوش و خروش کا مظاہرہ کیا کرتی تھی اور میں ہر بار اس سے وعدہ کرتا کہ اگلی مرتبہ اسے ڈھیر ساری چوڑیاں لے کر دوں گا اس بار وہ صرف ویسٹ بری گزارا کر لے۔

”فہ تم کتنے نجوس ہو حدید۔“ وہ بچوں کی طرح

منہ بسور لیتی اور میں اپنی جیب ٹٹول کر گردن جھکا لیتا۔
 ”واؤ، کتنی خوب صورت جیولری ہے نارونی میرا تو
 دل چاہ رہا ہے ساری کی ساری خرید لوں۔“ دونوں ہاتھ
 چہرے پر رکھے پر شوق لہجے میں بولتی مرانہ اک پل کو
 مجھے اویسنہ ہی لگی۔ جانے کیا بات تھی آج بل بل مجھے
 اس کی یاد ستارہ ہی تھی۔ اس کی باتیں، اس کا لہجہ، اس کا
 چہرہ، اس کی مسکان، کون سی ادا تھی جو میرے دل پر
 دستک نہیں دے رہی تھی میں اک آہ بھر کر رہ گیا۔
 ”ہاں جیولری تو تمام ہی اچھی ہے، مگر یار ساری کی
 ساری تو نہیں خرید سکتے تم نے جو بھی لیتا ہے لو اور پھر
 چلنے کی کرو، یہ کتنا وقت ہو گیا ہے گھر میں انکل اور
 آنٹی انتظار کر رہے ہوں گے۔“ ہارون نے اپنی رسٹ
 وایج مرانہ کی آنکھوں کے سامنے لہرا کر اسے احساس
 دلایا۔

”ہاں واقعی بہت دیر ہو گئی ہے، ماما اور بابا تو پریشان
 ہو گئے ہوں گے بس ابھی چلتے ہیں جسٹ اے
 منسٹ۔“ وہ پھر شوکیس پر چمک گئی تمام جیولری اتنی
 دل فریب اور جگر جگر کر رہی تھی کہ وہ چند لمحوں بعد گھبرا
 کر پلٹی۔

”رونی پلیز ہیلپ می، میرا سوٹ پر پل کھر کا ہے اسی
 مناسبت سے مجھے برسلیٹ لینا ہے۔“

”اوکے ہو تم“ ہارون اسے ہٹا کر خود آگے بڑھا میں
 بھی بڑھ کر شوکیس سے چپک گیا کچھ ہی دیر بعد ہارون
 نے پر پل کھر کے موتیوں سے مرصع برسلیٹ پیک
 کروایا تو میں بھی نارنجی رنگ کی گلے کی مالا کی طرف
 شاپ کیپر کو اشارہ کر چکا تھا۔

”یہ کس کے لیے؟“ ہارون مسکرا رہا تھا۔
 ”کس کے لیے ہو سکتی ہے؟“ النامیں نے سوال
 داغ دیا۔

”ہوں، سمجھ گیا۔“ اس نے معنی خیزی سے کہتے
 پیکٹ اٹھا کر مرانہ کو تھمایا تو میں نے بھی دو سرا پیکٹ
 اٹھالیا۔

”ہاں بھی لڑکیوں چلیں اب؟“ ہارون پوچھ رہا تھا
 ان تینوں کے سر ہلانے پر ہم نیویارک کے عظیم الشان

شاپنگ پلازہ سے باہر نکل آئے۔
 رات پوری طرح اپنی سیاہ چادر پھیلا چکی تھی۔
 سرشام، ہم یہاں آئے تھے جب ہر سو خوبصورت اجالا
 بکھرا ہوا تھا اب مصنوعی روشنیاں جھللا رہی تھیں
 اس عرصے میں ہارون اور میں بری طرح تھک چکے تھے
 میرا تو دل چاہ رہا تھا بیس کہیں پڑ کر سو جاؤں گرتا پڑتا بند
 ہوتی آنکھیں کھولتا میں ان سب کے ساتھ چل رہا تھا
 اور یونہی شرارتوں بھرے جملوں میں ہم منزل مقصود
 تک جا پہنچے تھے۔ اپنے پار ٹمنٹ کی سیڑھیاں چڑھ کر
 اوپر آئے تو ہارون کے حسب خیال لیزا آنٹی اور انکل
 اسفند ہمارے ہی انتظار میں بیٹھے تھے۔

”وہ تھینکس گاڈ تم لوگ آ گئے، اتنا دیر لگا دیا آخر
 کہاں رہ گئے تھے تم سارے۔“ ہمیں دیکھتے ہی لیزا
 آنٹی اپنے مخصوص انداز میں بولیں۔

بائیس سال ہو گئے تھے انہیں انکل اسفند کے
 ساتھ رہتے اس عرصے میں وہ اردو تو بہت اچھی بولنے
 لگی تھیں مگر لہجہ نہ بدلا تھا۔ مغربی عورتوں کی بے وفائی
 بہت مشہور ہے لیکن لیزا آنٹی کو دیکھ کر یہ بات بالکل
 جھوٹی معلوم ہوتی۔ ان کا رہن سہن، طور طریقہ اور
 خصوصاً بیٹیوں کی پرورش جیسے انہوں نے کی تھی اس
 سے لگتا تھا کہ جیسے کسی مشرقی عورت کی روح ان کے
 اندر حلول کر گئی ہوگی یا پھر یہ انکل اسفند کی محبتوں کا
 کمال تھا کہ نیویارک میں آباد اس چھوٹے سے خاندان
 کو انہوں نے پاکستان کی ہی خوشبو سے لبریز کیا ہوا تھا۔
 ہارون کے چہرے پر شرمندگی بھی تھی۔

”سوری آنٹی، ہم تو کوشش کر رہے تھے جلدی
 آنے کی، مگر آپ کی اس لاڈلی نے دیر کروادی۔ چار
 چیزیں خریدنے میں چار گھنٹے لگائے ہیں ان محترمہ نے
 ایک دکان سے دوسری اور پھر دوسری سے تیسری چل
 چل کر میری توانائگیں شل ہو گئیں آج۔“ اس کے
 چہرے پر اب بے چارگی اتر آئی تھی آنٹی نے مرانہ کو
 نیچے چتون سے گھورا۔

”بہت غلط بات، تم بہت تنگ کرتا ہے بے بی، میں
 نے سمجھایا بھی تھا کہ جلدی آنا مگر تمہارے

داگ (داغ) میں میری کوئی بات نہیں آتا اور ہم پریشان تھا۔ ”وہ غفا نظر آ رہی تھیں۔“

”اوہو، مماس میں پریشانی کی کیا بات آپ تو خواہ مخواہ گھبرا جاتی ہیں۔ اب بندہ کچھ خریدنے نکلے تو دیر سو رہتا ہو ہی جاتی ہے، آخر سو چیزوں میں سے ایک چیز پسند کرنا کوئی آسان کام تو نہیں اور یہ دیکھیں ہم کتنی زبردست شاپنگ کر کے آئے ہیں۔“ مریانہ بے تابی سے بولتی کاربٹ پر گھٹنے ٹکا کر بیٹھی اور شاپنگ بیگزز الٹ دیئے جس میں سے رنگ برنگ چیزیں نکل کر بکھریں تو لیزا آئی ایک لمحے میں سارا غصہ بھول بھال ایک ایک چیز اشتیاق سے دیکھنے لگیں۔

”مما اور ہم بھی دیکھیں۔“ مریانہ کی دیکھا دیکھی نوین اور افزا نے بھی اپنے بیگز ان کے سامنے الٹ دیئے، نکل بھی بیٹیوں کے پاس آ بیٹھے۔

”چل یار، اب ہماری یہاں کوئی جگہ نہیں رہی۔“ ان سب کو مصروف دیکھ کر میں نے ہارون کے کندھے پر ہاتھ رکھا۔

”ہاں یار ٹھیک کہتا ہے تو۔“ اس نے مریانہ کے جگمگاتے چہرے پر نگاہ ڈالی جو ہر طرف سے بے نیاز اپنی سفید کلائی میں لشکارے مارتا بریلیٹ دیکھتی خوش ہو رہی تھی۔ ہارون کی نگاہوں کے تعاقب میں دیکھتے میرے دھیان میں چہم سے ادب نہ اتر آئی۔

”فیروزہ اور سرخ کالج کی چوڑیوں سے بھی نازک کلائیاں میرے سامنے کیے بالکل یونسی خوشی سے دھکتا چہرہ لیے مجھ سے سوال کرتی ہوئی فیروزہ رنگ کے کرتا شلواریں میں ملبوس بڑا سا دوپٹا شانوں پر پھیلائے جس کے کناروں پر ستاروں بھری سرخ رنگ کی تیل لگی تھی ہلکا میک اپ کیسے کانوں میں چھوٹی سی بالیاں پہنے وہ بے انتہا پیاری لگ رہی تھی۔

”ہائے اللہ بتاؤ نا حدید۔“ میں یک ٹک اسے دیکھ رہا تھا اس نے دوبارہ استفسار کیا اور میں نے اس سے نظر ہٹا کے اخبار میں منہ دے لیا تھا جانے کیوں اسے ستانے کو دل چاہ رہا تھا اور اس میں برداشت کا مادہ تو تھا ہی نہیں بہت جلد جھنجھلا جاتی تھی اس وقت بھی

میرے کچھ نہ بولنے پر چڑ گئی۔

”سن نہیں رہے ہو میں کیا پوچھ رہی ہوں۔“ اس نے میرے ہاتھ سے اخبار جھپٹ لیا تھا اور میں نے پیشانی ٹھکنے آلود کرتے ہوئے اسے گھورا۔

”یہ کیا طریقہ ہے دنیا بہت بد تمیز ہوتی جا رہی ہو تم۔“ اوہرو اخبار اور کتنی بار کہا ہے میں تم سے پورے پانچ برس بڑا ہوں مجھ سے بات کرتے ہوئے ادب لحاظ ملحوظ خاطر رکھا کرو۔ خبردار جو آئندہ مجھ سے تو تزاخ کی تو۔“ میں خواہ مخواہ حد درجے سنجیدہ ہو رہا تھا اور وہ پوری آنکھیں پھیلانے مجھے دیکھ رہی تھی پھر اس کی آنکھیں یکدم سکڑیں اور اس نے اخبار میرے سر پر دے مارا۔

”ہونہ بڑے آئے کہیں سے، خود ہی تو کہتے ہو میں تمہارا دوست ہوں۔ بہت پکا والا دوست اور بھلا دوستوں میں تکلف کہاں ہوتا ہے میں تو تم ہی کہوں گی مجھے نہیں اچھا لگتا آپ واپ کرنا تمہیں اگر آپ آپ کروانا ہے تو جا کر ڈھونڈ لو کوئی اور دوست۔ آج سے میری اور تمہاری کٹی۔“ الٹا وہ مجھے ہی دھمکی دے کر جانے لگی تھی کہ میں نے اس کا دوپٹا تھام لیا۔

”اچھا بابا، مت کہو آپ، جا کہاں رہی ہو یہ چوڑیاں تو دکھاؤ کتنی اچھی لگ رہی ہیں۔“

”ج“ اچھی لگ رہی ہیں نا اور یہ میرا سوٹ بھی۔“ وہ پل۔ میں حنفی دور کے وہیں ٹھہر گئی تھی۔ بالکل میرے سامنے ایسے جیسے اجلا جانے۔

”اوہ، ہیرو، پھر ڈوب گیا مرا تہ میں۔ ایک تو میں تیری اس علوت سے بڑا عاجز ہوں، اور یہ تو دیکھ کے رہا ہے، اوئے بے غیرت وہ مریانہ ہے تیری ہونے والی بھانجھی۔“ ہارون نے میرے انتہاک پر دبے لمحے میں چٹکھاڑتے بے دردی سے میرے شانے پر دھپ جمائی۔ مجھے خیال ہی نہیں رہا تھا کہ چشم تصور سے ادب نہ کو دیکھتا میں مریانہ پر نگاہ جمائے ہوئے ہوں۔

”اوہ۔“ میں کچھ بخل سا ہو گیا۔ اپنی جھینپ مٹانے کو میں نے ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیلانی۔ ”ہاں پتا ہے مجھے وہ میری ہونے والی بھانجھی ہے۔“

کل اس کی سالگرہ جو تھی۔ اور اب وہ اپنی رنگین چیزوں میں کھوئی اسے دیکھنا بھی گوارا نہیں کر رہی تھی یہی وجہ ہارون کے چہرے پر بارہ سے تیرہ بجارہی تھی مجھے اس کی حالت زار پر ہنسی آنے لگی۔

”اوکے“ آنٹی گڈ نائٹ۔“ آخر کار ہارون نے ایک بے بس نگاہ مریانہ پر بچھاور کرتے ہوئے با آواز بلند کہا در پردہ وہ مریانہ کو متوجہ کرنے کی سعی میں تھا اور وہ ہنوز ادھر ہی تھیں۔

”اوکے مائے سن، جاؤ آرام کرو۔“ آنٹی نے ہم دونوں کا کندھا تھپکا۔ ہارون تھک کر میرا ہاتھ تھامے مرے مرے قدموں سے بیڈ روم کی طرف چل پڑا۔

”بڑی ہی بے مروت لڑکی ہے، اب کسے آنکھیں پھیر لی ہیں، تو تا چشم کہیں کی ایک تو اتنا تھکا کر لائی اور بیٹھنے تک کا نہیں کہا۔ حد ہوتی ہے لاپرواہی کی۔ اس پر پھوٹے منہ شکریہ کا ایک لفظ نہیں کہا۔“ کتنی مطلبی ہوتی ہیں یہ لڑکیاں ٹھیک ہے بھی۔ کل کرے یہ کوئی فرمائش۔ میں نے بھی جو پوری کی ہو تو۔“ وہ اس کی بے اعتنائی پر سلکتا برید کر رہا تھا۔

”چہرہ صبر کر، بچے صبر کا پھل میٹھا ہوتا ہے۔“ میں نے چہرے پر دلگھڑی دل فگاری طاری کرتے ہوئے اس کا ہاتھ سہلایا۔

”تو چپ رہ، بات نہ کر میرے ساتھ۔“ وہ میرا ہاتھ جھٹک کر اوندھے منہ بیڈ پر جا کر۔ میرے منہ سے ہنسی کا فوارہ چھوٹ گیا تھا اس کی حالت ہی کچھ ایسی تھی کہ میں ضبط نہ کر سکا۔ خوب ہنس چکنے کے بعد میں اس کے قریب آیا۔

”وہ ہیرو کرچکا تو اداکاری یا ابھی ایک آدھ المیہ نغمہ باقی ہے تو وہ بھی جلدی سے گا کر اپنے گھرے کو سدھار کیونکہ تیری اطلاع کے لیے مجھے بڑی فیند آرہی ہے۔ چل اٹھ ادھر سے بادولت کو محو استراحت ہوتا ہے۔“ میں نے اس کا موڈ قطعی نظر انداز کر دیا وہ سیدھا ہوا۔

”دیکھ حدید کے بچے، میرے منہ نہ لگ، ورنہ میں تیرا منہ توڑ دوں گا۔ دیکھ نہیں رہا میں کتنے غصے میں ہوں۔ میرا خون کھول رہا ہے، رگیں پھڑک رہی ہیں“

”تبھی دیدے پھاڑ پھاڑ کر دیکھ رہا تھا۔“ اس نے منہ بتایا۔

”ہاں دیکھ رہا تھا اور وہ یہ کہ اس پیاری لڑکی کے ساتھ کھڑے ہوئے ہارون صاحب کیسے لگیں گے اور یقین کرو ابھی مجھ پر یہ انکشاف ہوا ہے کہ یہ بات بالکل ایسے ہی ہوگی جیسے کہ حور کے پہلو میں لنگورو پے یار آپس کی بات ہے بڑا بے جوڑ رشتہ ہے وہ خود اتنی پری چہرہ اور محترم ہارون تو۔“ میں نے مسکراہٹ دباتے ہوئے الٹا اسے شرمندہ کر ڈالا۔ اس کے تیور بگڑ گئے۔

”تو ذرا اندر چل پھر بتاتا ہوں کہ محترم ہارون کیا ہیں۔“ وہ غرانا میرے کان میں گھس آیا۔

”میں کمرے میں ہی نہیں جا رہا کیونکہ اب فائدہ ہی کیا دوچار کھٹنے تو رہ گئے ہیں صبح ہونے پر جو میں یہاں بیٹھ کر بھی گزار سکتا ہوں۔“ میں ذرا متاثر نہ ہوا اس کی غراہٹ سے۔

”تو حدید۔!“ اس کی بات منہ ہی رہ گئی۔ لیزا آنٹی ہماری طرف متوجہ ہوئی تھیں۔

”تم دونوں کیا باتیں کر رہا ہو، ادھر آکر بیٹھو، ہمارے پاس میں دودھ گرم کر کے لاتی ہوں وہ پی کر اپنے بیڈ روم میں جانا۔“

”تو تھینکس آنٹی، دودھ کی گنجائش نہیں اب بس جا کر آرام کریں گے صبح جلدی اٹھنا بھی ہے۔“ ہارون نے فوراً ”ان کی پیشکش پر معذرت کی تو مجھے بھی اس کی تائید میں سر ہلانا پڑا۔

”اوکے، جیسا تم لوگوں کا مرضی جاؤ آرام کرو، تھک گئے ہو گے یہ لڑکیاں تنگ بھی تو بہت کرتے ہیں۔ میں نے اسی واسطے تم سے کہا تھا کہ میں خود انہیں لے جاؤں گی بر تم بھی نہیں مانا۔“ لیزا آنٹی نے ہارون کی بسورتی شکل دیکھتے ہوئے کہا تو وہ انتہائی مسکینمت سے سرخم کر گیا۔

وہ بھی سچ کہہ رہی تھیں انہوں نے تو پہلے ہی ہمیں اس قسم کی خطرناک صورت حال سے آگاہ کر دیا تھا لیکن کیا کیا جاتا ہارون کی دریا دلی کا کہ وہ خود دیوانہ ہو رہا تھا اپنی مریانہ کو اچھی اچھی شاپنگ کروانے کے لیے

دل جل رہا ہے۔“
 ”ہاں کچھ جلنے کی بات تو مجھے بھی آرہی ہے۔“ اس
 کے رکتے ہی میں سول سول کر کے ناک چڑھائی۔
 ”میں کم از کم آج کی تاریخ میں یہاں سے اٹھنے والا
 نہیں تو اپنا بندوبست کہیں اور کر لے۔“ اس نے تکیہ
 کھینچ کر سر بردھ لیا۔

”جی ہاں آپ اندر آئیے اور اس پوستی کو اٹھا کر لے
 جائیے۔“ میں نے آگے سے ہٹتے ہوئے اسے جگہ دی
 تو وہ اندر آئی بے سدھ سوتے ہارون کو دیکھا۔
 ”رونی روئی۔“ وہ آگے بڑھ کر آہستہ سے اسے
 پکارنے لگی۔ میں نے ٹرے نیل پر رکھی اور واش روم
 میں گھس گیا۔

”اف خدا اسے تو دین و دنیا کی خبر نہیں ہے۔“ میں
 باہر آیا تو وہ نچ ہوئی کھڑی تھی بد طلب نظروں سے
 مجھ دیکھا۔
 ”محنت میں عظمت ہے۔“ میں کندھے اچکا تا ٹاول
 اٹھا کر منہ پونچھنے لگا۔
 ”اوہ گاڈ“ وہ پیشانی پر آئے بال انگلیوں سے پرے
 کرتی پھر جھک گئی۔
 ”رونی روئی۔“ کی پکار برابر جاری تھی اور وہ کم بخت
 کان لیٹے بڑا تھا مجھے اندازا ہو گیا تھا کہ وہ جاگ چکا ہے
 مگر آنکھ کھولنے پر آملہ نہیں۔ مقصد محض مریانہ کو
 ستانا تھا اور وہ بے چاری واقعی گھبرا گئی تھی۔
 ”رات کو یہ کوئی ٹرینکولا تر لے کر تو نہیں سویا۔
 پلیز آپ ہی اسے دیکھیں۔ کیا ہو گیا ہے یہ جاگ کیوں
 نہیں رہا۔“ اس کے چہرے پر ہوائیاں اڑ رہی تھیں۔
 ”پریشان نہ ہوں اس کی نبض چیک کریں۔ ناک
 دبائیں دھڑکن بھی دیکھ لیں کہیں مر مرنا تو نہیں گیا۔“
 میں ٹاول اسٹینڈ پر ڈال کر اپنی ٹرے سنبھالنے بیٹھ چکا
 تھا۔
 ”ہائے اللہ نہ کرے۔“ وہ میری اس قیاس آرائی پر
 بے طرح دہل گئی۔ ہولی کر سینے پر ہاتھ رکھا۔ اک نظر
 ہارون پر ڈالی جواب تک گہری نیند کا تاثر دے رہا تھا۔
 ”ٹیک اٹ ایزی، ابھی دیکھیے گا یہ جاگتا ہے کہ
 نہیں۔“ اس کی پریشانی دیکھ کر ناچار مجھے اٹھنا ہی پڑا۔

دروازے پر جانے کب سے دستک ہو رہی تھی۔
 گہری نیند سے میری آنکھ اسی دھم دھم سے کھلی۔
 آنکھیں میسلے میں نے لپک کر دروازہ کھولا سامنے
 مریانہ کھڑی تھی۔
 ”گڈ مارنگ۔“ اس کے ہونٹوں پر پیاری سی
 مسکان تھی۔ جینز پر لانگ شرٹ پہنے کھلم کھلی
 اسکارف لیٹے اپنی دہلیز پر نگت کے ساتھ وہ نکری
 نکھری سی اچھی لگ رہی تھی۔
 ”صبح بخیر جیتی رہیے۔“ جواباً مجھ پر بھی مسکراتا
 فرض تھا۔
 ”میں آپ کے لیے ناشتالائی تھی آج آپ کچن
 میں نہیں آئے ابھی تک سو رہے تھے کیا؟“ اس نے
 ہاتھوں میں پکڑی ٹرے میری جانب بڑھائی۔
 ”جی ہاں اب کچھ ٹلی رات دیر بھی تو بہت ہو گئی تھی
 اس لیے جب سوئے تو حسب معمول سویرے آنکھ کیا
 کھلتی۔ ابھی آپ کی دستک سے ہی جاگا ہوں میں۔“
 ”ہاں یہ تو ہے رات ہم بھی دیر سے سوئے تھے
 میری بھی آنکھ دیر سے ہی کھلتی اگر میں الارم لگا کر نہ
 سوتی۔ نوین اور افزا تو ابھی تک سو رہے ہیں۔
 خیر آپ ناشتا کریں میں ذرا ایک بار پھر روٹی کے
 بیڈ روم کا دروازہ بجا آؤں جانے کیسی نیند سویا ہے وہ کہ
 جاگ ہی نہیں رہا۔ کابل انسان۔“ وہ خود کلائی کے
 انداز سے کتے پلٹنے کو تھی کہ میں نے پکار لیا۔
 ”ٹھہریں مریانہ آپ کو ہارون کے بیڈ روم تک

☆ ☆ ☆

میں نے اور کچھ نہ کیا بس ہارون کی گردن پر ہاتھ رکھ دیکھے اور اگلا پل نہیں ہوا تھا کہ وہ مجھے دھکیلا اٹھ بیٹھا۔

”لو گدھے مارنے لگا تھا مجھے تو دوست ہے کہ دشمن ابھی مجھے کچھ ہو۔“ مجھ پر آنکھیں نکالنے کی سعی میں ناکام ہو کر بری طرح کھانسنے لگا آخر بے چارے کا بیٹا دبتے دبتے رہ گیا تھا۔

”رونی یہ کیا بد تمیزی ہے میں کتنی دیر سے آوازیں دے رہی ہوں تم اٹھ کیوں نہیں رہے تھے۔“ مرانہ نے سکھ کا سانس لے کر شکوہ کیا۔

”آپ کون ہیں خوب صورت خاتون۔“ وہ بمشکل کھانسی روک کر اسے دکھاتا تنی سنجیدگی سے پوچھنے لگا کہ مرانہ کے چھکے چھٹ گئے۔

”رونی واٹس روٹنگ وڈیو میں مرانہ ہوں کیا ہو گیا ہے تمہیں۔“

”کون مرانہ کیسی مرانہ کہاں کی مرانہ گدھر ہے مرانہ۔“ وہ ہنوز اس سنجیدگی سے ادھر ادھر دیکھنے لگا اور اس کی برداشت یہیں تک تھی وہ باؤں پر سر کر واک آؤٹ کر گئی۔ ہارون کے بلند و بانگ قہقہے میرے چھوٹے سے کمرے کے دروازے پر اڑھانے لگے۔

”اوئے اوئے رحم کر کیوں زلزلہ لانا چاہتا ہے۔ پورے امریکہ میں مجھے فقط ایک یہی ڈر ہے نما کرم ملا ہے اگر یہ بھی تیرے بے سرے قہقہوں کے زیر ستم آگیا تو میں نما کدھر جاؤں گا۔“ میں ایک ہی جست میں بیڈ پر جا بیٹھا اور اسے تھام کر قابو کیا۔

”اوہو ہو سکون آگیا میری رات کی ساری تھکن دور ہو گئی دیکھا کیسے تنگ ہو کر گئی ہے۔“ اپنا کارنامہ بیان کرتے اس کے قہقہے رکنے میں نہیں آ رہے تھے۔ ”شباباش بڑا کمال دکھایا ہے ایک معصوم سی لڑکی کو ستا کر شرم نہ آئی تجھے بے ہودہ انسان۔“ میں نے اسے ایک دھپ تھادی۔

مرانہ سے ہمدردی محسوس ہو رہی تھی وہ سیاہ سی لڑکی اکثر اس بد تمیزی کی خفگیوں کا بار اٹھاتی تھی وہ اسے ستا کر ایسے ہی خوش ہوتا تھا اور وہ گھنٹوں بے کل

رہتی۔
”اے واہ مجھے کیوں شرم آئے گی بلکہ مجھے تو مزہ آتا ہے تنگ کر کے سچ بتا جب میں اس سے ناراض ہوتا ہوں تو وہ پریشان ابھی ابھی سی اچھی لگتی ہے نا۔“ ہارون نے میرے گھٹنے پر سر رکھ دیا۔ میں نے اسے نادہی نظروں سے گھورا۔

”دیکھ یار رونی یہ کوئی اچھی بات نہیں ہے۔“ خواجہ اسے ستانا اور تیرا حفظ اٹھانا تو ایک لڑکی کو تنگ کر کے خوش ہوتا ہے تف ہے تجھ پر اور پھر لڑکی بھی بھلا کون ہے وہ جو تجھ سے پیار کرتی ہے ابے الو کوئی ہوش کے ناخن لے۔ مرانہ تجھ سے ناراض ہو گئی ہے بہتر یہی ہو گا کہ تم فوراً سے پیٹھ جاکر منالو۔ آج کا دن کتنا اہم ہے جسے وہ اچھے طریقے سے منانے کا سوچے بیٹھی ہے اور تم ہو کہ اس کی صبح ہی خراب کر دی بہت افسوس کی بات ہے۔“ میں نے اس کے سر کے نیچے سے گھٹنا کھینچ لیا۔

”اف بڑا خبیث ہے تو حدید خیر تجھ سے تو بعد میں بنوں گا پہلے مرانہ کا موڈ درست کر آؤں اسے ناراض کر کے میں نے واقعی غلط کیا ہے“ وہ سر سہلاتا نئے عزم کے ساتھ بیڈ سے اترتا۔

”ویل ڈن یہ کی ہے نل بات۔“ میں بے ساختہ خوش ہوا کہ اس نے میری نصیحت پر عمل کرنے کا ارادہ باندھا تھا اور اس ارادے کے سنگ وہ کمرے سے بھی جا چکا تھا۔

میں مطمئن سا اٹھا الماری سے جائے نماز نکالی اور سر پر رومال باندھنے لگا۔ اپنے دیس میں تو کبھی نماز پڑھتے تھے تو کبھی نہیں بھی۔ میں چار سال قبل ایسا کا نمازی نہ تھا جیسا کہ اب میں نماز کا دھیان رکھنے لگا تھا اب بھی اکثر ہنچ جاتا تھا نماز تو ادا نہ ہوتی تھی مگر جو بھی وقت میسر آتا میں ضرور نماز کی ادائیگی کرتا۔

نماز فجر کا وقت تو گزر چکا تھا میں نے قضا نماز کی نیت باندھ لی اس کے بعد نماز اشراق بھی ادا کی پھر اپنے رب کے حضور ہاتھ پھیلا کر انتہائی ڈوب کر اپنے سب پیاروں کے لیے خوشیاں اور سکون کی دعائیں مانگنے لگا

میں ان سب سے میلوں کے فاصلے پر ہو کر بھی ذہنی اور دلی طور پر ان ہی کے درمیان رہتا تھا کہ اس میں میرا سکھ اور اطمینان تھا۔ ہر بل ہر لمحہ انہیں یاد کرنا میرے لیے باعث قرار تھا۔

”تم اتنی دور جا کر ہمیں بھول تو نہ جاؤ گے جدید۔“ دلکش آنکھوں میں نمی لیے میری یاد کے پردے پر اکثر اویں کا چہرہ ابھرتا۔ نازک لبوں پر یہ خدشہ لیے وہ کتنی اداس تھی۔

”تم نے یہ کیسے سوچا میں ساری دنیا کو بھول سکتا ہوں لیکن تم سب کو نہیں۔“ میں نے پر یقین و پر اعتماد لہجے میں کہتے اس کے آنکھوں میں جھانکا تھا۔

”جی تو پھر وعدہ کرو اپنی اس دوست کو کہیں بھی کبھی بھی نہیں بھولو گے۔“ وہ اب عہد چاہتی تھی اپنا گلابی ہاتھ میرے سامنے پھیلا دیا۔

”وعدہ۔“ میں نے اس کا ہاتھ تھام لیا۔ اور وہ یک لخت ہی میرے شانے پر سر ٹکائے بھل بھل رونے لگی تھی۔

”دینا پیاری یہ کیا ہے بھی۔“ میں اس کے رونے پر پریشان ہوا تھا۔ بھلا میں اس کی آنکھ میں آنسو کہاں دیکھ سکتا تھا۔ مجھے تو اس کی آنکھیں ہنسی مسکراتی اچھی لگتی تھیں۔ میں نے بہت تیزی اور بہت پیار سے ان آنکھوں سے گرتے تمام گوہر آبدار اپنی ہتھیلیوں کی اوک میں سمیٹ لیے ان موتیوں میں سے ایک موتی بھی فرش پر گرنے نہیں دینا چاہتا تھا مجھے یہ گوارا نہ تھا کہ یہ موتی زمین پر گریں وہ آنکھیں میری زیست کا چراغ تھیں۔

”تمت روؤ دینا میں نے وعدہ تو کیا ہے یقین کرو میرا اور دیکھو پلیز تمہیں پتا ہے نا۔ میں تمہیں روتے ہوئے نہیں دیکھ سکتا۔“ اسے سمیٹنے بھلانے کی سعی میں میرا ہنڈل کر لانے لگا تھا۔

”سوری بس کیا کروں مجھے یہی خیال دبلا رہا ہے کہ تم اتنی دور چلے جاؤ گے تو میں بالکل اکیلی ہو جاؤں گی۔ کون ہوگا میری سننے والا میری تو تمہارے علاوہ کسی سے دوستی بھی نہیں جی کہ اپنی بہنوں سے بھی نہیں۔“

ان کی تو اپنی الگ دنیا ہے۔ ان کا اور میرا مزاج نہیں ملتا۔ بھائی ہے تو وہ بس ہر وقت تنگ کرنا جانتا ہے۔ اماں الگ میرے پیچھے پڑی رہتی ہیں۔ یہاں کوئی بھی نہ ہوگا تمہاری طرح خیال رکھنے والا تم ہی تو میرے اچھے دوست ہو تم چلے جاؤ گے تو میں تمہیں بہت یاد کیا کروں گی۔“ وہ بری طرح سسک رہی تھی اور مجھے اس کی معصومیت پر ٹوٹ کر پیار آیا میرا بس نہیں چلا تھا اس پیاری سی لڑکی کو اپنے سینے میں چھپالوں۔ وہ مجھے کتنی عزیز کس قدر پیاری تھی اس بات کا علم تو اسے بھی نہیں تھا۔

”دینا میں بھی تمہیں وہاں جا کر بہت مس کروں گا“ لیکن دیکھو یوں رونے سے کیا حاصل، تم فکر نہ کرو میں سب کو سمجھا کر جاؤں گا کہ میرے پیچھے تمہارا بہت زیادہ خیال رکھیں۔ تمہاری ساری فرمائشیں پوری کریں اور رہا یہ سوال کہ تمہاری کون سا کرے گا تو میں ہوں نا۔ تم مجھے خط لکھا کرنا اپنی ہر بات، ہر خیال، ہر سوچ، ہر شرارت میں تمہارے خطوط کا بے چینی سے منتظر رہا کروں گا پھر میں بھی تمہیں خط لکھا کروں گا بس اب خوش۔“ میں نرمی سے اس کے بال سہلانے لگا وہ کچھ کہنے کے بجائے سوں سوں کرتی رہی۔

”جدید بھائی۔“ میں یادوں کی چلمن اٹھائے ماضی کے آنگن میں جھانک رہا تھا جانے افرا کب آکھڑی ہوئی تھی میں اس کی آواز پر چونکا۔ دعا کے لیے اٹھائے ہاتھ جوں کے توں تھے اور میں کہاں سے کہاں پہنچ گیا تھا میں نے جلدی سے منہ پر ہاتھ پھیر کر اس کی جانب رخ کیا۔

”کیا مانگ رہے تھے اتنا محو ہو کر۔“ وہ مسکرا رہی تھی۔

”بس وہی معمول کی دعائیں“ میں نے اٹھ کر بجائے نماز کی جبکہ درحقیقت آج تو میں کچھ مانگنے کی بجائے ہاتھ پھیلائے ہی رہ گیا تھا بس اس کی یاد اس کا خیال یونہی تو بے خود کر دیتے تھے کہ آس پاس سب بھول جاتا۔

”آپ کو ہارون بھائی بلارہے ہیں، جلدی سے

آجائیں۔“ وہ جس مقصد سے آئی تھی پیغام دیتی دروازہ یار کر گئی تو میں بھی اس کے پیچھے ہی نکل آیا۔

☆ ☆ ☆

”واپس کب تک آؤ گے حدید؟“ اور نہ اپنے ہر خط میں مجھ سے کچھ اور پوچھے نہ پوچھے سوال ضرور پوچھا کرتی تھی اکثر اپنے خطوں میں وہ یادیں دہرایا کرتی۔

”سچ حدید میں تمہیں بہت یاد کرتی ہوں۔ بے حد اداس رہتی ہوں تمہارے لیے کبھی کبھی تو تمہاری کمی بے پناہ شدت سے محسوس ہوتی ہے اب پھر موسم رنگ بدل رہا ہے۔ بہار بہت چمکے سے اپنا خیمہ سمیٹ رہی ہے۔ فضا میں بکھری خوشبوئیں ماند پڑ رہی ہیں پھول کھلا رہے ہیں گری اپنے پر پھیلا رہی ہے اور اس موسم کی طویل تپتی دھوپ میں تو اب مجھے ڈرانے لگی ہیں تمہیں یاد ہے نا؟ مجھے دھوپ میں کبھی نیند نہیں آتی تھی۔ تمام دھوپ میں جلے پر کی پٹی کی طرح پورے گھر میں چکرایا کرتی۔ اس سے گھر کی خاموشی اور چار سو پھیلا سنا مجھے بے طرح گھبراہٹ میں مبتلا کرتا سب سورہے ہوتے۔

اور کبھی تم گھر آتے تو میں تمہارے سر ہو جایا کرتی تھی کہ اف حدید یہ منحوس دھوپ تو گزارے نہیں گزر رہی۔ کتنی بوریٹ ہے کیا خیال ہے کوئی گیم نہ کھیلا جائے۔ اور تم ہمیشہ کی طرح فوراً میری بات مان جاتے۔

اماں کو تو خدا موقع دے میرے لئے لینے کا وہ تواناں میں رہتی ہیں کہ کب کوئی بات ہو اور وہ میرے کفن کھینچیں۔ مائدہ کا تو پتا ہی ہے۔ اس کی اپنی الگ ڈیزھ اینٹ کی مسجد ہے۔ سارا دن سر جھکائے گھر کے کاموں میں لگی رہتی ہے اس لیے اماں کی سرچڑھی ہے میں کتابوں میں سر کھپاتی ہوں۔ جو اماں کو کھٹکتا ہے۔

اب تو میں خود ان کی پھٹکاروں کی اس قدر علوی ہو گئی ہوں کہ جب تک دن بھر میں دو تین بار ان کی ڈانٹ نہ سن لوں مزاجی نہیں آتا جان بوجھ کر انہیں تنگ کرتی رہتی ہو۔“ (دینا تمہاری یہ شرارتیں

آخر کب باز آؤ گی اپنی حرکتوں سے۔) میں بے اختیار مسکرا دیا۔

”یہاں تو سب ہی مجھ سے تالاں ہیں اک بس پھوپھو ہی ہیں جو میری طرف داری کرتی ہیں تمہارے جانے کے بعد میں ان کے بہت قریب ہو گئی ہوں ہم تمام وقت تمہیں ہی یاد کرتی ہیں تمہاری باتیں کرتے ہیں میرے ساتھ ساتھ پھوپھو بھی بہت اداس ہیں تمہارے لیے حدید کب آؤ گے؟“

”اؤں گا بہت جلد آؤں گا دینا بس تھوڑا انتظار اور یاد تو میں بھی بہت کرتا ہوں تمہیں کیا خبر میرے دن و رات کیسے بسر ہوتے ہیں تم سے دور۔ تمہیں دیکھے بنا۔ یہ ملیوں کے فاصلے مجھے تڑپاتے ہیں لیکن کیا کروں میں نے تم سے دوری کا عذاب اسی لیے تو سہا ہے کہ خود کو اس قاتل بنا سکوں کہ تمہاری ہر چاہ پوری کر سکوں تمہارے تمنائیں، تمہاری آرزو میں تمہارے ارمان یقین کرو میں تمہارا دامن دنیا جہان کی خوشیوں سے بھر دینا چاہتا ہوں اور ان شاء اللہ وہ وقت بہت جلد آئے گا بہت جلد۔“ میں تصور میں دینا کو مخاطب کیسے اس سے ڈھیروں باتیں کرتا اس کے سبک خواہشوں کی ریشم تاروں سے سہانے خواب بنتا لیکن جب اسے خط لکھنے بیٹھتا تو جانے کیا ہوتا ساری خوبصورت باتیں ذہن کے کسی گوشے میں ہی چھپی رہ جاتیں اور میں اسے کچھ بھی نہ لکھ پاتا جس کا اسے ہمیشہ گلہ رہتا۔

”اف خدا یا حدید میں جتنی بے چینی سے تمہارے خط کی منتظر رہتی ہوں وہ اتنا ہی اختصار لیے ہوتا ہے۔ تمہارا خط بڑھتے مجھے بے ساختہ یہ محاورہ یاد آتا ہے ”کھودا پہاڑ نکلا چوہا“ خدا را ایسا مختصر خط مت لکھا کرو مجھے بے حد غصہ آتا ہے بھلا یہ کیا طریقہ ہے میری طرح خط کیوں نہیں لکھتے جیسے میں لکھتی ہوں ڈھیر ساری ادھر ادھر کی باتیں، معنی و بے معنی باتیں، سوچیر والی تو کبھی بے سرو پا باتیں، کام والی تو ننگی باتیں کچھ تو لکھا کرو نا۔

اپنی مصروفیات کے بارے میں ہی کہ وہاں کیا کرتے

آئی پراس یو۔ آئی لائک یو اینڈ آئی ریٹلی لویو۔ میری سامنے اس کے خط بکھرے پڑے تھے اور میں اس کی یادوں میں کھویا خود سے بھٹی گمانہ ہو گیا تھا۔ صحن ماضی کی چلمن اٹھی ہوئی تھی اور میں سبج سبج چلتا اندر کھو گیا تھا۔



کالج سے واپسی پر میرا معمول ہوا کرتا تھا کہ کھانے کے بعد کچھ دیر آرام کرتا کہ میری پیاری ماں کی تاکید ہوتی تھی پھر اسٹور پر چلا جاتا کہ یہ ابائی ہدایت تھی۔ اور شام کو وہاں سے واپسی پر ملاجی کی طرف جانا تو لازمی ہوتا تھا کہ یہ میرے دل کی خوشی ہوتی تھی میری ہر شام وہیں گزرتی ایک ہی گلی میں کچھ فاصلے پر ہمارے گھر تھے میں وہاں جاتا تو رات گئے ہی لوٹا اس روز بھی میں جلد ہی اسٹور سے اٹھ کر ادھر آ گیا تھا گھر میں قدم رکھتے ہی مجھے ایسا لگا تھا کہ جیسے یہاں سب ہی اک دو سرے سے ناراض ہیں اماں صحن میں پیچھی چارپائی پر کسی گہری سوچ میں گم۔ بیٹھی تھیں۔ صارم ان کے قریب ہی چپت لیٹا آسمان پر اڑتی چٹنگیں گن رہا تھا مائدہ اک کونے میں سوئی دھاگہ اور دوپٹا لیے کڑھائی کرتی مصروف نظر آئی کالمہ آیا باورچی خانے کی دہلیز میں کھڑی چاول چن رہی تھیں ان کا انداز بھی سوچتا ہوا تھا۔ اور دینا چھت پر جاتی سیڑھیوں پر بیٹھی منہ گھٹنوں پر رکھے آڑی تر پھی لکیریں کھینچ رہی تھی میں نے سب کو دیکھتے ہی زوردار سلام بھارا۔ جس کا جواب مجھے صرف صارم کی طرف سے موصول ہوا۔ پانی سب نے سراٹھا کر مجھے دیکھا ضرور مگر پھر گردنیں پیچی کیے اپنے اپنے کام میں مگن ہو گئے۔

”آئیں حدید بھائی۔ کہہ دیجئے کیسے مزاج ہیں؟“ صارم نے اپنی جگہ سے اٹھ کر مجھے بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ تو میں چارپائی پر اماں کے پاس ٹک گیا۔

”میرے مزاج تو بہت اچھے ہیں مگر تم لوگوں کو کیا ہوا ہے۔ اتنے خاموش کیوں ہیں سارے۔ خیریت تو ہے ناشیں فطری طور پر فکر مند ہوا پہلے تو کبھی ایسا نہیں

ہو دن لیے گزرتے ہیں دیک اینڈ کیسے گزارتے ہو۔ ہارون بھائی، مریانہ، نون، آفری کے بارے میں ہی لکھ دیا کرو۔ یا لیز آئی کا انداز گفتگو چلو اس بار ضرور تفصیلاً“ لکھنا اور اب میری سنو میں آج کل بے حد خوش ہوں یوں تو میں ہمیشہ ہی خوش رہتی ہوں مگر ان دنوں بہت زیادہ خوش ہوں پوچھو کیوں تو وہ یوں کہ میں نے اماں سے یونیورسٹی میں ایڈمیشن لینے کی اجازت لے لی ہے

میں بے اندازہ خوش ہوں اور تم دعا کرو کہ جس طرح میرا یہ خواب حقیقت بن رہا ہے اسی طرح میرے دوسرے تمام خواب بھی پورے ہوں۔ (آمین) میں صرف تمہارے لیے ہی تو دعا کرتا ہوں دینا۔ تم کیا جانو کہ تم سے زیادہ تو میری تمنا ہے کہ وہ رب تمہارے سارے خوابوں کو جسم حقیقت کروے اور ایسا ہو گا ضرور ان شاء اللہ)

ہاں تمہیں ایک اور خبر بھی سناتی ہوں وہ یہ کہ بہت جلد مائدہ کی شامت بھی آنے والی ہے۔ اگر واقعی مائدہ کی شادی ہو گئی تو میرا کیا ہو گا۔ کیونکہ مائدہ کے جانے کے بعد گھر کے سارے کام میرے ناتواں کاندھوں پر آ پڑیں گے تم تو جانتے ہو مجھے گھرداری سے رتی برابر رغبت نہیں۔ کس قدر کام چور ہوں میں بقول اماں ہڈ حرام، نکمی، آکسی کی ماری ہوئی، پوسٹن اور دیگر بہت کچھ یہی تو ابھی سے سوچ کر ہول آرہے ہیں آخر کیا ہو گا میں تو اب یونیورسٹی بھی جانے لگوں گی پھر کیسے سنبھال پاؤں گی سارا گھر۔ (وہ نکما صارم بھی ابھی کسی لائق نہیں کہ اس کی ہی شادی کر دی جائے اور مسئلہ حل ہو جائے) خیر دیکھا جائے گا ایسا وقت آیا تو پایا سے کموں گی وہ اپنی اس شنزادی بیٹی کے لیے خود ہی ملازمہ کا انتظام کریں گے ٹھیک ہے نا۔

”ہاں ٹھیک ہے تم واقعی شنزادی ہو اور نہ بلکہ ملکہ میری میرے دل کی بس کچھ دن اور میں پاکستان آیا تو خود تمہارے لیے خلاؤں کی لائن لگا دوں گا جو چنگی بجاتے تمہارا ہر حکم بجا لائیں یہی خواہش ہے نا تمہاری اور میں تمہاری تمام خواہشات پوری کروں گا

رہی ہوں کچھ زیادہ تو نہیں۔ اس پر بھی آپ اتنا غصہ ہو رہی ہیں بس چند سو روپے کا تو خرچہ ہے۔ حدید پلیز تم ہی سمجھاؤ۔“ ان سے کہتے وہ مجھ سے مدد کی خواستگار ہوئی۔

”یہ کیا سمجھائے مجھے، سمجھنے کی ضرورت تو مجھے خود ہے جانتی نہیں ہے گھر کے حالات تم لوگوں کا باب ہے چار دن رات محنت کرتا ہے تب کہیں جا کر اس گھر کا چوہا جلتا ہے جو وہ صبح سے شام کو لو کا تیل بنے تو تم لوگ کھانے کو ترسو پر تم جیسی اولاد صبر شکر تو ایک طرف الٹا فرمائشوں کا انبار لگائے رکھتی ہے آئے دن نت نئے کھٹ رنگ ڈالے ہوتے ہیں۔ اب یہ نیا تماشا شرم تو نہ آئے گی تجھے اوکاریاں کرتے مجھے تو سوچ کر ہی ہول اٹھ رہے ہیں اور تجھے حیا نہیں۔ انوکھے کام کرتی ہے کم بخت۔ میں تو عاجز آگئی ہوں تیرے ان چوچلوں سے۔“ اماں نے ماتھے پر ہاتھ مارتے اپنی شدید بے بسی کا اظہار کیا وہ قل قل کرتی ہنس پڑی۔

ہوا تھا۔ اتنا سا اور وہ بھی سب کے ہوتے ہوئے اور آوازیں نہیں تو کم از کم دینا اور صدارم کی نوک جھوک تو چل ہی رہی ہوتی۔ یہ وہ دنوں اور پر تلے کے تھے اور ان کی آپس میں بہت کم بنتی تھی ہمہ وقت چونچ لڑائے رکھتے جس پر اماں کی انہیں بڑتی صلواتیں۔ اک شور مچا کر مچا ہی رہتا تھا یہاں زندگی کی مکمل حرارت کے ساتھ مگر آج تو بالکل چپ چھائی ہوئی تھی۔

”اے خیریت کیسے ہو سکتی ہے اس جگہ جہاں ان جیسی سعاتیں ہوں پاگل، سر پھری اولاد، جانے کس گناہ کی سزا ہے یہ میرا تو بیاغ خراب کر دیا ہے نامراد نے۔“ اماں تو بھری بیٹھی تھیں میرے استفسار پر آگیا کرگو یا ہو میں انہوں نے جن کینہ تو ز نظروں سے دینا کو دیکھا مجھے سمجھنے میں دیر نہیں لگی کہ آج پھر اس نے انہیں تنگ کیا ہے۔

”کیا ہوا اماں کیا دینا نے بد تمیزی کی ہے مجھے بتائیں ابھی کلن کھینچتا ہوں اس کے۔“ میں نے اسے ہنسی سے ان کا ہاتھ تھاما۔

”اے کوئی ایک بد تمیزی ہو تو بتاؤں بھی۔ تم اس کے جتنے مرضی کلن کھینچ لو وہ لے لے تو ہو جائیں گے پر سیدھے نہ ہوں گے میرا تو کلیجہ جلا رکھا ہے اس نے کسی نہ کسی چیز کی کمی رہتی ہے اسے۔ روزنت نئی فرمائشیں ہیں شہزادی صاحبہ کی۔ میں پوچھتی ہوں آخر کیا بنے گا اس کا، ایسی بے صبری لڑکی ہے یہ ذرا اس کے مزاج میں سمجھداری نہیں۔ نہ بات سمجھتی ہے نہ حالات۔ بس جو چاہتی ہے ہتھیلی پر دھرا لے جائے اسے۔ اب آج کی ہی سن لو میرے منع کرنے کے باوجود اس نے کالج میں ہونے والے کسی ڈرامے میں حصہ لے لیا ہے اور اب کہتی ہے کہ مجھے اس ڈرامے میں پہننے کے لیے نیا سوٹ چاہیے۔ ایک تو نا فرامانی اور سے فرمائش میں پوچھتی ہوں باپ نے فیکٹریاں لگا رکھی ہیں جو ہر بائگ پوری کرتے چلے جائیں۔“ اماں سخت پی ہوئی تھیں ادھر دینا نے جھکا سر اٹھایا۔

”باپ نے فیکٹریاں نہیں لگا رکھیں پر کپڑے والوں نے تو لگا رکھی ہیں نا اور صرف ایک سوٹ ہی تو مانگ

ادب خانہ دہلی کی طرف سے منظم کیے گئے محفل کا نام

شعیرہ کھنجر

نظم گو شمسائی



قیمت - 550 روپے

منگوانے کا پتہ

مکتبہ عمران ڈائجسٹ

37، اردو بازار، کراچی

فون نمبر: 32735021

”لو اماں کی باتیں سنو میں کون سا برا کام کرنے لگی ہوں۔ جو شرم اور حیا کروں کئی لڑکیوں میں سے سلیکشن ہوئی ہے میری آپ کو تو خیر ہونا چاہیے کہ آپ کی پوتی کوئی عام سی لڑکی نہیں ارے بہت خاص چیز ہیں ہم۔“ اس نے اک اوا سے فرضی کالر جھاڑے۔

”میں پھر اپنی ایسی خاص چیز سے۔ کان کھول کر سن لے میں تجھے ایک پیسہ نہیں دینے کی۔ پچھلے دنوں بھی اپنے الیم تللوں میں میرا ڈیڑھ ہزار ضائع کروایا تھا تو نے مدد یہ کوئی درختوں پر نہیں آتا جو توڑ توڑ کر تجھ پر وارتی رہوں۔ آئی سمجھ۔“ اماں بہت سختی سے کہتی اٹھ کھڑی ہوئیں۔

”آگئی بہت اچھی طرح میں نے تو بابا سے روپے مانگے تھے انہوں نے کہا تھا اماں سے لے لینا لیکن آپ تو دے نہیں رہیں چلیں بالکل نہ دس۔ رات کو بابا آئیں گے تو میں انہیں سے لے لوں گی۔“ اماں کے اٹھتے ہی وہ بھی کھڑی ہو گئی لہجہ پر سکون اور اٹل تھا اور یہ تو اس کی فطرت تھی کہ جو سوچ لیا ہے وہی کرنا ہے اپنے فیصلے سے وہ ایک انج بھی نہیں سیرکتی تھی اور اماں کو ماؤ دلانے کے لیے یہی بات کافی تھی وہ اسے خون آشام نظروں سے گھورتی پھر بیٹھ گئیں۔

”دیکھو دیکھو ذرا اس کی ڈھٹائی۔ اری نامراد جب میں کہہ رہی ہوں کہ یہ کام نہیں کرنا تو پھر ماز کیوں نہیں آئی اور تیرا باپ کہاں سے دے گا پیسے وہ تو آج کل خود پریشان ہوا پھر رہا ہے خبردار جو تو نے اور اسے ستایا۔ خدا جنت نصیب کرے تیری ماں کو ایسی سیدھی ایسی بھولی تھی وہ جو کھلایا کھالیا جو ہنسلیا پہن لیا مجھے نہیں یاد کہ کبھی اس نے کوئی ضد کوئی فرمائش کی ہو۔ کبھی دکھ نہیں دیا تھا اس نے ہمیں۔ خدا سلامت رکھے تیرے باپ کو وہ بھی ایسا ہی سادہ منش ہے۔ میری دونوں بچیاں کاملہ اور ماندہ بالکل اپنی ماں جیسی ہیں اس کی طرح سیدھی اور صابر۔ اک تو ہی اللہ جانے کس پر گئی ہے ایسی ضدی ایسی ہٹ دھرم توبہ توبہ۔“

”وہ مائے ڈیئر گرینڈ مایہ سوچ کر پریشان نہ ہوا کریں

کہ میں کس پر گئی ہوں۔ مجھے بھلا کیا ضرورت ہے کسی پر جانے کی یونہی ہم جیسے یونیک لوگ کسی سے صورت، شکل، عادات، مزاج کچھ بھی مستعار نہیں لیتے ہم اپنی مثال آپ ہوتے ہیں۔ میں اویںہ ہوں آپ کی پوتی اویںہ افضل بس یہ یاد رکھا برس اور ہاں جو کہہ رہی ہوں وہ بھی مت بھولیے گا ٹھیک ہے نا۔“ ان کے چپ ہوتے ہی وہ شاہانہ انداز سے بولتی چلی گئی جس پر اماں پھر بھڑک اٹھیں۔

”سچ ہی کہتی ہے نامراد تو اپنے آپ پر ہی گئی ہے تیرے جیسی ڈھیٹ نہ تو اس خاندان میں پہلے کوئی تھی اور خدا کرے نہ آئندہ کوئی ہو۔ تیری ماں زندہ ہوئی تو مجھے اتنے برسہائے میں تیرے ہاتھوں جلنا تو نہ پڑا وہی اٹھاتی تیرے ناز خیرے اور ایسے کرتوتوں پر اچھی طرح خبر بھی لیا کرتی۔ میں تو لحاظ کر جاتی ہوں ورنہ تو دل کرتا ہے ایک ہی بار مرمت کر کے رکھ دوں۔“

”آئے ہائے نہ یاد کروایا کریں مجھے میری ماں ۴۷ کا ش کہ وہ زندہ ہوتیں تو یقین کریں کبھی مجھے اس قدر بے دردی سے کوسنے نہ دیتیں نہ بات بات پر نامراد کہیں میرے ذرا سے رونے سے ہی ان کا دل موم ہو جایا کرتا۔ ماں ماں ہوتی ہے اپنی اولاد کے لیے وہی دل سے حساس اور مخلص ہوتی ہے اس جیسا کوئی اور نہیں۔ حتیٰ کہ داوی بھی نہیں۔ اب بیہوش دیکھ لیں میری ذرا سی خواہش پر آپ اتنی سختی پاؤں بیٹھی ہیں۔ ہائے میری کم نصیبی کاش میں کسی بڑے گھر میں پیدا ہوئی ہوتی کسی خوبصورت ترین کو بھی میں رہتی بے پناہ چاہنے والے ماں باپ کی اگھوتی اولاد ہوتی، میری کوئی خواہش تشنہ نہ رہتی میری زندگی مکمل ہوتی۔ خوشیاں، سکھ، اطمینان ہائے مگر کیا ہو کہ میری یہ زندگی اویںہ میرے خواب بس میرے خواب۔“ وہ اک اوا سے پیشانی پر ہاتھ رکھے آہوں پر آہیں بھر رہی تھی۔ اماں اس کی اتنی دلچسپی پر انگشت بدنداں تھیں میں زیر لب مسکرا دیا۔ صابر م بڑی سنجیدگی سے اٹھا اور دینا کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر بولا۔

”تو افسردہ نہ ہو میری بہن، تیرے خواب پورے

بیوٹی بکس کا تیار کردہ

سوتنی ہیسر آئل

SOHNI HAIR OIL

- ✽ کرتے ہوئے بالوں کو روکتا ہے
- ✽ بے بال آگاتا ہے۔
- ✽ بالوں کو مضبوط اور چمکدار بناتا ہے۔
- ✽ مردوں، عورتوں اور بچوں کے لئے
- ✽ یکساں مفید۔
- ✽ ہر موسم میں استعمال کیا جاسکتا ہے۔



قیمت - 120/- روپے

سوتنی ہیسر آئل 12 جزی بونٹوں کا مرکب ہے اور اس کی تیاری کے مراحل بہت مشکل ہیں لہذا یہ تھوڑی مقدار میں تیار ہوتا ہے، یہ بازار میں یا کسی دوسرے شہر میں دستیاب نہیں، کراچی میں دستی خرید جاسکتا ہے، ایک بوتل کی قیمت صرف - 120/- روپے ہے، دوسرے شہروں والے مٹی آڈر بھی کرر جڑ پائسل سے منگوائیں، رجسٹری سے منگوانے والے مٹی آڈر اس حساب سے بھجوائیں۔

- 2 بوتلوں کے لئے ----- 300/- روپے
- 3 بوتلوں کے لئے ----- 400/- روپے
- 8 بوتلوں کے لئے ----- 800/- روپے

نوٹ: اس میں ڈاک خرچ اور پیکنگ چارجز شامل ہیں۔

منی آڈر بھجئے گئے لئے ہمارا ہند:

بیوٹی بکس، 53- اورنگزیب مارکیٹ، سیکنڈ فلوور، ایم اے جناح روڈ، کراچی

دستی خریدنے والے حضرات سوتنی ہیسر آئل ان جگہوں سے حاصل کریں

بیوٹی بکس، 53- اورنگزیب مارکیٹ، سیکنڈ فلوور، ایم اے جناح روڈ، کراچی

مکتبہ عمران ڈائجسٹ، 37- اردو بازار، کراچی

فون نمبر: 32735021

ہو سکتے ہیں۔ کیا ہوا جو تم کسی امیر گھرانے میں پیدا نہیں ہوئیں لیکن تم کسی امیر گھر میں جاتو سکتی ہونا، میں کرتا ہوں تمہارے لیے کوشش ڈھونڈتا ہوں کوئی امیر کبیر آدمی جو تمہاری تمام خواہشات پوری کر سکے۔

”ہائے سچ“ ارے جگ جگ جیو میرے بھائی۔ تم نے تو میرے دل کی بات کہہ ڈالی تم گتے اچھے ہو میرے بھائی۔“ صدارم کی غیر سنجیدگی پر وہ بھی یقیناً ”غیر سنجیدہ ہی تھی مگر اس مکالمے پر اماں نے تو اپنے کال پیسٹ لپے۔

”لوئی نوج“ اے چھوٹی مر جائے تو دیدوں کاپانی مر گیا ہے تیرے بے حیا۔ کیسے پر پڑ زبان چلتی ہے تیری اور اس کم بخت کو دیکھ شرم بچ کھائی ہے وہاں ہیات انسان ایسے باتیں کرتے ہیں بہنوں سے وہ نامراد تو ہے پاگل ساتھ تو بھی ہو گیا۔“

”اماں! اماں میں تو مذاق کر رہا تھا دل رکھ رہا تھا اپنی بے چاری بہن کا۔“ ان کا چپل کی طرف ہاتھ بڑھتا دیکھ کر صدارم نے بھاگنے میں ہی عافیت جالی دیتا بھی ہنستی ہوئی ہلو کی اوٹ میں ہوئی اگر وہ دونوں بروقت اپنی جگہ نہ چھوڑتے تو یقیناً واقع تھا ان دونوں میں سے وہ چپل ضرور کسی ایک کو شرفِ ملاقات بخشتی۔

”غضب خدا کا بالکل ہی آپے سے باہر ہو گئے ہو تم لوگ اپنی اوقات میں رہنا سیکھو حد ہو گئی اتنی بکواس کوئی لحاظ شرم ہی نہیں رہ گئی تم لوگوں کے اندر۔“ اماں مارے عیش کے ہانپنے لگیں، چہو سرخ پڑ گیا، سانس پھول گئی۔

”فہ اماں آپ بھی کن بے وقوفوں کی باتوں میں آرہی ہیں پلیز ریلیکس پریشان نہ ہوں غصہ مت کریں بیٹھ جائیں۔“ میں نے لپک کر انہیں تھاما اور ٹھنڈا کرنے کی سعی کی انہوں نے میرا ہاتھ جھٹک دیا۔

”ارے کیسے غصہ نہ کروں میرا تو خون ہی جلا دیا ہے ان ظالموں نے۔“

”اوہ اب جلنے بھی دیں اور یہ آپ کیا کہہ رہی ہیں آپ کا خون جل گیا جبکہ آپ کا چہرہ تو لال اتار ہو رہا ہے اگر خون جلا ہوتا تو آپ کے چہرے کو زرد ہونا

چاہیے تھا۔" میں نے شرارت بھرے لہجے میں کہا تو انہوں نے گھور کر مجھے دیکھا۔

"بالکل درست کہہ رہے ہو بھائی آخر ہماری اماں جان نے پچھلے زمانے کا ایسی کھی خالص دودھ تازہ سبزیاں شیریں پھل کھا رکھے ہیں سرخ انار چروان کا نہیں ہو گا تو کیا ہمارا ہو گا۔" صادم ہنستا ہوا کچن سے نکلا ہاتھ میں پانی سے بھرا گلاس تھا جو اس نے اماں کی خدمت میں پیش کیا۔

"بیچے ادا مہالی پیجیے اور غصہ تھوک دیجیے۔" ہاں بس یہی تو کر سکتی ہوں میں۔ تھوک ہی دوں ایسے غصے کو جس کا کسی پر کوئی اثر نہیں۔" انہوں نے ہاتھ مار کر گلاس پر بے گردیا۔ وہ شدید ناراض ہو چکی تھیں میں اور صادم لگے ان کی فٹیں کرنے اور آخر کار انہیں پانی پلا کر ہی دم لیا۔

"اچھا بھئی میں چلتا ہوں اور ہاں دینا کو امی یاد کر رہی تھیں کیا اسے لے جاؤں اپنے ساتھ۔" میں اٹھ کھڑا ہوا اور اماں سے اجازت چاہی۔

"جو مرضی آئے کرے جاتی ہے تو لے جاؤ اور ماں سے کہنا بے شک جتنے دن چاہے اپنے پاس رکھے اور اگر ہو سکے تو تھوڑی سی عقل بھی سکھا دے اس مصیبت کی پوٹ کو۔" وہ تو پہلے ہی اکتائی ہوئی تھیں میرے کہنے پر انہوں نے جیسے شکر ادا کیا تھا۔ دینا تڑپ کر ہلو کی اوٹ سے نکلی اس سے پہلے کہ وہ کچھ بولتی میں نے ہونٹوں پر انگلی رکھ کر اسے خاموش رہنے کا اشارہ کیا اور اپنے پیچھے آنے کا بھی۔ سب کو خدا حافظ کہتا میں دروازے کی سمت بڑھا۔

"سناتم نے جدید اماں مجھے مصیبت کہہ رہی تھیں۔" گھر سے نکلتے ہی وہ انتہائی مظلومیت سے بولی۔ آج تو مجھے بھی اس پر خوب ہی غصہ آیا تھا میں آگے چل بڑا۔

"ایسا کچھ غلط بھی نہیں کہہ رہی تھیں۔" "کیا" یقیناً اسے شاک لگا تھا اک پل کو تو وہ بالکل ہی چپ رہ گئی پھر چیخ کر بولی۔ "ہاں ہاں اب تم بھی کہو۔ مصیبت، عذاب"

پریشانی، میرا تو وجود ہی سب کے لیے آزار ہے میں تو ہوں ہی بری، تم سارے ہی۔"

"منہ بند کر کے چلو۔" میں نے بری طرح جڑ کر ٹوکا اور مجھے خود محسوس ہوا میرا لہجہ قدرے سخت تھا اس کی جو میرے چہرے پر نظر پڑی تو پھر کچھ نہ کہا۔ بقیہ راستہ خاموشی میں ہی طے ہوا۔

گھر میں داخل ہوتے ہی میں اس کا بازو دوپچے اپنے کمرے میں لے گیا اسے کرسی پر دھکیلا اور جتنا غصہ مجھے آ رہا تھا اس کا اظہار کرنے میں نے ذرا بھی بخل سے کام نہ لیا۔ میں نے اسے بری طرح ڈانٹا۔ خوب سنائیں، کمرے کے ایک کونے سے دوسرے کونے تک چکر لگاتے ہوئے میں جانے کیا کچھ کہہ گیا اور جب ذرا سانس لینے کو بھر کر اسے دیکھا تو بے اختیار اپنا ہی سر دیوار سے ٹکرانے کو بی چلا۔ وہ بڑی فرصت سے میگزین کی ورق گردانی کر رہی تھی یعنی اس نے کچھ بھی دھیان سے نہیں سنا تھا اور میں نے گویا بکو اس کی تھی۔

"دینا، دینا" میں نے بے انتہا رنج ہوتے ہوئے اپنے ہی بال مٹھی میں جکڑ لیے۔

"وہ ختم ہو گئی تمہاری تقریر، اتار لیا غصہ، چلو اچھی بات ہے۔ ویسے میں حیران ہوں تم بھی اتنا فضول بول لیتے ہو۔"

میگزین رکھ کر وہ مسکراتی ہوئی کھڑی ہوئی تو مجھے اس کے الفاظ نئے سرے سے پانگے میں نے اس کی پشت پر جھولتی بسی چوٹی کھینچ لی۔ "آہ آؤف۔" وہ چلا اٹھی۔

"دینا ایمان سے میں سچ کہہ رہا ہوں کسی دن بہت بری طرح پنوگی میرے ہاتھوں بہت ستانے لگی ہو سب کو کہیں کہتا ہوں باز آ جاؤ۔"

"وہ ہو میں نے بھلا ایسا کیا کر دیا ہے کہ سارے ہی نہاد ہو کر میرے پیچھے بڑگئے ہیں۔" معصومیت تو بس اس لڑکی پر ختم تھی مجھے اس پر مزید تاؤ آیا۔

"واہ بہت خوب اتنا کچھ کر کے بھی محترمہ فرما رہی ہیں کہ کیا کیا ہے اور جب واقعی کچھ ایسا ویسا کریں گی تو

”ہائے سچ حدید۔“ اس کے بجھے چہرے پر یکدم روشنی اتری۔
 ”کیوں تمہیں کوئی شک ہے پہلے کبھی میں نے تمہاری کوئی بات ٹلی ہے ایک سے بڑھ کر ایک بے کار ضد پوری ہے تمہاری۔“

”ہاں یہ تو ہے ویسے میری کوئی بھی ضد بے کار نہیں ہوتی۔“ وہ شرارت سے ہنسی پھر مجھے اپنی حالیہ فرمائش کی تفصیلات بتانے لگی اور میں دل کڑا کر کے سنتا گیا۔
 اب خود چھری تلے گردن رکھ دی تھی تو بھگتنا تو تھا۔



اور بہت عرصے بعد اس گھر میں بھی کوئی خوشی کی کرن چمکی تھی۔ امی کے بعد اماں نے اپنے ناتواں کندھوں پر ساری ذمہ داری لی تھی اور بحسن و خوبی سنبھالیتی رہی تھیں۔ اب بس دن رات انہیں ایک نئی فکر تھی کہ اپنی پوتیوں کے فرض سے بھی جلد از جلد سبکدوش ہو جائیں اور اس سلسلے میں دو روز قبل ماما جی کے دوست کی فیملی سے چند خواتین کا ملہ آیا کو دیکھنے آئی تھیں اور کاملہ آیا کو جتنا خدا نے نرم و دھیمہ اور حساس مزاج دیا تھا اتنی ہی پیاری صورت بھی دی تھی نازک سرا، دلکش نقوش لمبے گھٹنے بال، ان کی شخصیت تو ایسی سن موہنی تھی کہ کوئی بھی انہیں ناپسند نہیں کر سکتا تھا وہ خواتین بھی پہلی ملاقات میں متاثر ہو گئی تھیں اور جاتے ہوئے بہت اصرار سے ہمیں بھی اپنے ہاں آنے کی دعوت دے گئی تھیں اور چونکہ ان کا گھر انہ اور ان لوگوں کو دیکھنا بھاننا ضروری تھا۔ اس لیے تیسرے روز اماں نے وہاں جانے کا ارادہ کیا امی تو ان کے ساتھ جا ہی رہی تھیں انہوں نے مجھے بھی اپنے ساتھ چلنے کا حکم دیا اور دینا بھی ضد کر کے ساتھ ہوئی۔



میں اپنی ہی دھن میں مگن سا گھر میں داخل ہوا تھا صحن بالکل خالی تھا میں۔۔۔ کمرے کی طرف ہولیا اور ابھی اندر جانے کو ہی تھا کہ دینا کی آواز نے مجھے وہیں

پھر ہم مسکینوں کا تو خدا ہی وارث ہو گا دیکھ لڑکی سدھر جا۔ اماں عاجز آئی رہتی ہیں تمہاری حرکتوں کی وجہ سے کچھ شرم کرو کیوں پریشان کیے رکھتی ہو انہیں۔“ میں نے اسے پھر سے کرسی پر دھکیلا اور خود سامنے بیٹھ گیا۔
 ”ارے واہ یہ خوب کھی تم نے۔ میں پریشان کرتی ہوں انہیں یا وہ پریشان کرتی ہیں مجھے اللہ کے فضل سے بابا کی بہت اچھی کمائی ہے مگر وہ ہماری اماں جان ایسی کنجوس ہیں کہ ان کی کمائی کے تین حصے دبا کر فقط ایک حصے سے ہم سب کو ترسار ترسار لار لار کپالتی پوستی آئی ہیں جانے بچت کا اتنا مراق کیوں ہے انہیں۔“

بابا تو جو کچھ کما کر لاتے ہیں سب ان کی ہتھیلی پر دھر دیتے ہیں اور میں یہ بھی جانتی ہوں اماں کا وہ عزیز از جان ہمسکھ جسے وہ اپنی ماں کی نشانی بتا کر کسی کو بھی ہاتھ لگانے کی اجازت نہیں دیتیں وہ پورے کا پورا میرے باپ کی کمائی سے بھر پڑا ہے یہ تو سراسر زیادتی ہے نا۔ وہ گھر کا خرچہ بھی کسی درجہ کفایت سے کرتی ہیں وہ بھی سب کے سامنے ہے اور جب کسی ضرورت کے تحت ان سے چند روپے بھی مانگ لو تو صفا چیٹا انکار کر دیتی ہیں۔ اگر زیادہ اصرار کرو تو کوسنے اور گالیاں دینے پر اتر آتی ہیں ایک بار ان کے اس قیمتی خزانے کی چابی میرے ہاتھ لگ جائے پھر دیکھنا کیا کرتی ہوں میں۔“ اس نے سپدھے ہاتھ کی ہتھیلی پر الٹا ہاتھ مار کر اپنے جارحانہ عزائم کا اظہار کیا میں چیراں ہو کر رہ گیا وہ تو اماں سے بہت زیادہ بدگمان لگتی تھی میں نے بے ساختہ اسے ٹوکا۔

”اچھا اب زیادہ بولنے کی ضرورت نہیں۔ ہو سکتا ہے تمہاری بات سچی ہو مگر اماں جو کرتی ہیں تو تم لوگوں کے بھلے کے لیے ہی کرتی ہیں آخر کو تین لڑکیوں کا بوجھ ہے ان پر کوئی مذاق نہیں۔ اگر آج بچت نہیں کریں گی تو کل کیسے اس فرض سے سبکدوش ہوں گی وہ سمجھدار خاتون ہیں اور تم بھی سمجھداری سے کام کیا کرو آئندہ ان سے فضول بحث کرنے کی کوئی ضرورت نہیں اور اگر ایسا ہی کچھ ضروری چاہیے ہوتا ہے تو مجھ سے کہہ دیا کرو میں جو ہوں۔“

مہر نے پر مجبور کر دیا وہ بے لہجے میں کہہ رہی تھی۔
 ”افوہ آپا سمجھتی کیوں نہیں ہیں میں آپ کے بھلے کو
 ہی کہہ رہی ہوں اسی لیے تو میں اس روز ضد کر کے
 وہاں گئی تھی اور سچ پوچھیں تو مجھے ان لوگوں سے مل کر
 قطعاً کوئی خوشی نہیں ہوئی تھی وہ لوگ تو آپ کے
 معیار کے ہی نہیں ہیں بہت ہی فضول لوگ ہیں وہ اس
 روز تو ہمارے سامنے انہوں نے خود پر تھوڑی سی پالش
 کر لی تھی مگر اندر کا میل پھر بھی جھانک رہا تھا جو میں
 نے دور ان گفتگو بخولی محسوس لیا ان توبہ اور ان وہ
 چھوٹا سا پرانی طرز کا مکان جس میں مجھے ڈھونڈنے سے
 بھی کوئی بہتر سہولت نظر نہیں آئی۔ پلستر اکھڑی
 دیواریں ٹوٹے فرش کمرے میں قدم دیکھ زدہ فرنیچر
 رکھا تھا اور سجاوٹ کے نام پر پیتل و تانے کے برتن و
 گلدان یقین مانیں مجھے تو وہ گھر کی انشٹیک شاپ کا
 نمونہ لگ رہا تھا چلیں گھر تو رہ گیا ایک مفسد شخص
 جس سے آپ کو تمام زندگی کے لیے نکتہ کرنے کا
 سوچا جا رہا ہے۔ ذرا ان کی خویوں پر بھی روشنی ڈال
 لیں کیا ہیں وہ کیپٹن شہیار صاحب ایک فوجی جو اپنی
 جان جو کھوں میں ڈال کر بمشکل چند ہزار تنخواہ پاتا ہے
 ان کی تو صورت بھی کوئی خاص نہیں اس پر ان کی
 نوکری وہ صاحب تو سر تپا سرکاری ہیں۔ ان کے کپڑے
 سرکاری ان کے جوتے سرکاری، ان کا کھانا سرکاری
 یعنی ان کے پاس اپنا تو کچھ بھی نہیں وہ تمام عمر بھی محنت
 کریں تا تو ایک خوب صورت گھر نہیں بنا سکتے اب آپ
 خود سوچیں ایسی زندگی سے کیا حاصل کہ ایک ڈربے
 سے نکل کر دو سرے میں چلی جائیں۔“
 ”افوہ چھوٹی میں کیا کہوں تجھے تو کچھ سمجھ نہیں
 آرہی۔“ آپا کی آواز میں لاچارگی تھی۔
 ”تو سمجھیں نا اس رشتے سے صاف انکار کروں یہی
 آپ کے لیے بہتر ہے۔“ اس نے مشورہ دیا۔
 ”ناگل ہوئی ہو کیسے انکار کروں۔ بابا نے ان لوگوں
 کو ہاں کر دی ہے اب بھلا میں انکار کر کے ایک نیا تماشا
 لگا دوں یعنی سب کی خوشی ملیا میٹ کروں۔ نہ بابا نہ مجھ

میں اتنا حوصلہ نہیں۔ اہل اور بابا میرے دشمن تو نہیں
 سوچ سمجھ کر ہی فیصلہ کیا ہے انہوں نے اب تو جو
 ہو رہا ہے اللہ کرے بہتر ہو۔“

اپنی ذات ملیا میٹ کرنے کا حوصلہ ہے آپ میں تو
 پھر ٹھیک ہے جائیں گزاریں وہ سسکتی زندگی اپنے
 خوابوں کو اپنے ہی ہاتھوں موت کے گھاٹ اتار کر بھی
 کوئی سکھی رہ سکا ہے۔ آپ بھی نرا گھائے کا سودا
 کر رہی ہیں دیکھ لیجیے گا آپ۔“ وہ حد درجے چڑی
 تھی۔

”افوہ اب تم مجھے بددعائیں تو مت دو اور یہ کیا
 خوابوں خوابوں کی رٹ لگا کر میرا بھی دماغ گھما رہی ہو
 حقیقت کی دنیا میں رہنا سیکھو چھوٹی۔ اس عمر کے
 خواب خود فریبی اور خود اذیتی کے سوا کچھ نہیں ہوتے
 آج یہ خواب تمہیں احساس محرومی کا شکار کیے ہوئے
 ہیں کل کو اگر خدا نہ کرے تم ان کی تعبیر نہ پاسکیں تو بڑا
 دکھ ملے گا کیوں خود کو ان سنہری زنجیروں کا قیدی بنائے
 رکھتی ہو بنگلی سمجھدار بنو۔ حقیقت کیسی بھی ہو اسے
 پوری طرح فیس کرنا چاہیے دنیا میں ہم سے ہزاروں
 لوگ ہیں اور کروڑوں ہم سے کمتر ہمیں اپنے اطراف
 نگاہ رکھنی چاہیے اپنے جیسوں کو دیکھیں خود سے نیچے
 والوں کو دیکھیں اس میں ہماری بقا ہے اگر ہم صرف خود
 سے اور والوں کو دیکھتے رہیں گے تو میری جان اس میں
 سراسر ٹھوکر لگنے کا خدشہ ہے تم خود کو سنبھالو ان
 خوابوں کے ریشم میں مت الجھو مجھے تو گھبراہٹ ہونے
 لگی ہے تمہاری باتوں سے مصنوعی دنیا میں رہنا چھوڑ دو
 ادینہ۔“ وہ آپا کو ترغیب دے رہی تھی کہ اللہ اس کی
 ناصح بن گئیں۔

”افوہ اشاپ آپا مجھے سمجھانے کی ضرورت نہیں
 مجھے اپنے خواب اور ان میں رہنا اچھا لگتا ہے اور دیکھیے
 گا میں ان خوابوں کی تعبیر پا کر رہوں گی۔ مجھے اس
 سسکتی زندگی سے نفرت ہے میں صرف ایسے شخص
 سے شادی کروں گی جو میرے تمام خوابوں کو پورا کرنے
 کی اہلیت رکھتا ہو میں کسی شٹ پونجیے سے ہرگز

شادی نہیں کروں گی جو میری زندگی کو نری پریشانی بنا کر رکھ دے مجھ سے نہیں ترسا جاتا اور اسی خوشی کے لیے اور نہ ہی قتل کر سکتی ہوں اپنے خوابوں کو ہتا نہیں آپ کس طرح کہتی ہیں یہ سب۔

اس کے لمحے میں اتنی نغوت، رعونت اور کڑختگی تھی کہ میں چند لمحوں کو تو سن ہو کر رہ گیا۔ افسانہ لڑکی اور اس کے خواب اتنے اونچے اتنے بلند کہ میں تو ان کی گرد کو بھی نہیں چھو سکتا تھا کیا تھا میں۔ اک بہت عام سا شخص سادہ زندگی، محدود وسائل اور اس نے تو اپنا معیار بہت خاص بنا رکھا تھا اس نے خود کو خواہشوں کے اس قلعے میں محصور کر رکھا تھا جس کی فلک بوس فیصلیں دیکھنے کے لیے مجھے اپنا سر بہت اونچا کرنا پڑتا وہ تو بہت فاصلے پر تھی کہ میں ہاتھ بڑھا کر اسے محسوس بھی نہیں کر سکتا تھا میرے اور اس کے درمیان یہ کیسی خلیج تھی۔ اس کے ہی خوابوں کی خلیج میرا محبتوں سے لپرز دل اس کربناک کیفیت پر کراٹنے لگا اک اذیت تھی کم مائیگی کا احساس دو چند ہو گیا پھر مجھ سے مزید کھڑا نہ رہا جس کا میں تھکے تھکے قدموں سے واپس ہوا۔



میں اسے چاہتا تھا آج سے نہیں جانے کب سے میں نے اسے بے پناہ محبت دی پل پل اس پر توجہ کا سایہ کیا۔ اس کی چھوٹی چھوٹی خوشیوں کا بھرپور خیال رکھا اس کے لبوں کی مسکان پر قرار رکھنے کے لیے ہر جتن کیا۔ وہ کچھ اس طرح میری نس نس میں سا گئی تھی کہ میرے لیے اس بن جینے کا تصور محال تھا اور یہ احساس ہونے پر کہ میری اتنی محبتوں کے باوجود وہ مجھ سے کتنے فاصلے پر ہے میں کتنا ٹوٹ گیا تھا۔

وہ مجھے بہت عزیز تھی اور اس کی خوشیاں بھی۔ میں تو ہمیشہ سے اس کی خواہشوں کا احترام کرتا آیا تھا۔ تو کیا اب نہ کرتا۔ گو کہ یہ میرے لیے میری محبت کے لیے اک امتحان تھا اور مجھے اب اس امتحان سے گزرنا ہی تھا۔ بس پھر مجھ پر اک جنون سوار ہو گیا کچھ کر گزرنے کا اور چند ہی دنوں میں مجھے اندازا ہو گیا تھا کہ یہ سب

انتا آسان بھی نہیں مجھے تو اس مقام تک پہنچنے کے لیے بہت عرصہ درکار ہو گا اور انتا انتظار تو میں خود نہیں کر سکتا تھا۔

اور اچانک ان ہی دنوں میرا بہت پیارا دوست ہارون اپنے چچا کے پاس امریکہ جا رہا تھا وہ میرا ہمراز تھا جانتا تھا میرے دل کی ہر بات یہ اسی کا مشورہ تھا کہ میں اس کے ساتھ چلوں یہاں تو کئی سالوں تک بھی میں محنت کرتا رہتا تو شاید اس کے خوابوں میں رنگ نہ بھر سکتا۔ جبکہ وہاں جا کر کچھ ہی عرصے تک میں اپنا مطلوب بنا سکتا تھا اور اس کا مشورہ میرے دل کو لگا تھا۔ اور میرے اس فیصلے سے تو گھر بھر میں کھلبلی مچ گئی تھی۔ امی نے تو رو کر برا حال کر لیا اب الگ ناراض ہوئے۔ ماما جی نے سمجھانے کی کوشش کی۔ ثانی اماں نے فتویٰ دے دیا لڑکا بولا ہو گیا ہے۔ کاملہ آپا نے الگ میری منتیں کیں ان کی شادی میں چند دن ہی تو رہ گئے تھے اور میں ان کی خوشیاں بے رنگ کر کے جا رہا تھا مائدہ اور صارم بھی خفا ہو گئے۔ بس اک وہی تھی جس نے بے پناہ خوش ہو کر میری بیٹھ چھکی تھی۔

”واؤ تم نے تو کمال کر دیا۔ ایسا نادر خیال تمہاری کھوپڑی میں آیا کہاں سے تم تو اتنے عقل مند نہ تھے۔ تم نے تو حیران کر دیا ہے کچلو شکر ہے ہم میں سے کسی کو تو اپنی زندگی کا خیال آیا کسی نے تو قدم آگے بڑھائے۔ تم تو وہاں جا کر تھوڑے ہی دنوں میں ڈالر ز میں کھیلنے لگو گے دیکھو مجھے ہرگز نہیں بھولنا اور وہاں جا کر سب سے پہلے مجھے ڈالر بھیجنا میں نے آج تک ڈالر نہیں دیکھے۔“ وہ بول رہی تھی میں مسکرا کر رہ گیا۔

”اف میری کتنی ٹور بن جائے گی اپنی سہیلیوں میں جب میں انہیں بتاؤں گی کہ میرا لڑکا امریکہ گیا ہے۔ یہ تو سارے پاگل ہیں تمہارا دل تو ڈر رہا ہے تم بالکل نہ گھبراؤ اور جم گے تیاری کرو میری دعائیں تمہارے ساتھ ہیں۔“ اس نے سب کے چروں پر نظر ڈالتے کہا جبکہ سارے اسے گھور رہے تھے۔

اور مجھے وہ پل نہیں بھولتا جب میں اپنے دیس سے اپنے سب پیاروں سے جدا ہونے کو تھا سب ہی او اس

کندھے پر جھول گیا تو میں نے اسے اٹھا کر پرے بٹھا۔
”سوری کے لگتے، کسی دن تیرے یہ ہاتھ ہی توڑ
دوں گا میں، لوہے جیسے دنلی ہاتھ ہیں تیرے لے کے
میری کمر توڑ دی۔“ میں نے اپنے پشت سہلاتے اسے
گھورا۔

”نہ نہ حضور مجھ غریب پر یہ ظلم مت کیجیے گا۔ اگر
آپ نے میرے یہ خوبصورت ہاتھ توڑ دیے تو میں کن
ہاتھوں سے اپنی مرانا کا گھونٹ اٹھاؤں گا۔“ وہ
جس انداز سے کہہ رہا تھا میں نے ہنستے ہوئے
اسے ایک دھمکا کر بولا۔

”بڑا بد تمیز ہے تو۔“
”کم تو تم بھی نہیں ہو میاں دیوانے۔ اب یہ بتاؤ کیا
دینا کا کوئی نیا خط نہیں آیا جو یہ پرانے بکھرائے بیٹھے ہو
خیر تو ہے لگتا ہے رات بھر سوئے بھی نہیں ہو۔“ وہ
سیدھا ہوتے ہوئے میری آنکھوں کی سرخی دیکھ کر
جان گیا۔ میں نے بھی مدھم سی مسکراہٹ کے ساتھ
سر ہلادیا۔

”ہاں یار اور صرف رات ہی نہیں میں تو کئی راتوں
سے ٹھیک سے نہیں سو رہا جانے کیا بات ہے چند
دنوں سے وہ مجھے بے پناہ یاد آ رہی ہے۔ ہر لمحہ ہر گھڑی
ہر طرف ہر منظر میں مجھے اس کا چہرہ نظر آتا ہے کسی
دوسرے کی صورت پر اس کا گمان ہونے لگتا ہے میری
تو خود سمجھ میں نہیں آ رہا کیا ہو رہا ہے میرے ساتھ اتنا
عرصہ اس سے دور خود کو سمجھا کر گزارا ہے کیسے
پہاڑ سے تھے یہ برس اور کس طرح گزرے ہیں میں ہی
جانتا ہوں مگر اب لگتا ہے تھک گیا ہوں۔ مزید سفر کی
سکت نہیں رہی اور دوری سہہ نہیں پاؤں گا اب اس
جدائی کا کرب برداشت نہیں ہوتا مجھ سے۔“ میرے
وجود کی تمام تھکن میرے لہجے میں بولنے لگی تھی
ہارون نے میرا کندھا تھپکا۔

”تو خود کو کیوں اذیت دے رہے ہو میرے
بھائی۔ تم اب تھکو گے نہیں تو اور کیا ہو گا۔ ادینہ کے
لیے خوشیاں جمع کرتے ہوئے تم نے دن دیکھانہ
رات۔ کبھی اپنی صحت کا خیال کیا نہ اپنی ذات کا۔

تھے میرا ہنسل ڈوب ڈوب کر ابھر رہا تھا بس ایک دینا ہی
چڑیاں کی طرح چمک رہی تھی وہ بہت خوش تھی مگر
جب میں گھر سے نکلنے لگا تو جہاں سب کی آنکھوں میں
آنسو تھے وہ بھی ایک دم چپ ہو گئی۔
”تمہیں کیا ہوا تم نے کیوں منہ لٹکا لیا؟“

”تم۔ تم اتنی دور جا رہے ہو۔ تم وہاں جا کر کہیں
ہمیں بھول تو نہ جاؤ گے میں تمہیں بہت یاد کروں گی
حدید ریکی آئی مس یو۔“ ایک ہی سانس میں بولتی اس
کی آنکھیں بھی بھگ چلی تھیں اور میرا دیوانہ دل اک
مدھرتال پر رقص کنال ہو گیا تھا وہ میری کمی محسوس
کرے گی۔ میرے بغیر کیسے رہے گی مجھے یاد کرے گی
میرے لیے یہ زاوراہ ہی بہت تھا میں اس کی کیفیت پر
بے اختیار ہستارہا۔

اس سے دور جانے کا سوچ کر میری اپنی حالت بھی
کچھ ایسی ہی تھی۔ جی تو چاہ رہا تھا کہ دل میں چھپا کے
اسے بھی ساتھ لے چلوں مگر یہ ممکن کہاں اپنی اس
خواہش کو ممکن بنانے کے لیے ہی تو میں اک طویل سفر
پر نکلا تھا اس سے اتنی دور آ گیا تھا اور اب یہاں میں تھا
اور میری بے تابیاں۔ میں اس کے خطوط کا منتظر رہتا
اس کی آواز سننے کو بے چین میرا تو بس نہیں چلتا تھا کہ
اڑ کر اس کے پاس پہنچ جاؤں یا اسے اپنے پاس بلا لوں
مگر ہائے یہ بچ کی دیوار۔

”اوہ ہیرو لگتا ہے گزشتہ رات پھر تجھ پر دورہ پڑا ہے
اس کی یادوں کا۔ تیرے کمرے کا اجڑا نقشہ یہ بکھرے
کاغذ یہ تیری سرخ آنکھیں۔ یہ اچھے بال بے ترتیب
حال، اوئے ہوئے میرا پارتو پورے کا پورا مجنوں لگ رہا
ہے۔“ ہارون صبح ہی صبح میرے کمرے میں آن دھمکا
تھا اور میرے آس پاس بکھرے دینا کے خط دیکھ کر اس
نے بے تکلفی سے میری پشت پر ہاتھ جمایا تو میں بلبل
اٹھا۔

”اوہو، ہو، لگتا ہے ہاتھ کچھ زیادہ زور سے پڑ گیا، سو
سوری یار۔“ وہ بے ہودگی سے دانت دکھاتا میرے

لیے فکر مندی اور پیار تھا۔
 ”وہ تو ٹھیک ہے یار، مگر میرا پروگرام تو کچھ اور تھا۔
 دینا ابھی پڑھ رہی ہے یہ اس کا فاسٹ اسٹیڈیو اور میں
 نے سوچا ہے کہ جب وہ انگریزوں سے فارغ ہو جائے گی تو
 میں اچانک جا کر اسے حیران کر دوں گا۔“ میری
 آنکھوں میں اس خیال سے ہی اک تصور بندھ گیا تھا۔
 ”اوہ بس رہنے دے حیران کرنے کا پروگرام بہت
 ہو گیا کہیں اس چکر میں تم خود پریشان نہ ہو جانا۔“
 ہارون نے ہاتھ لہرایا۔

”خدا نہ کرے“ میں دہرایا۔
 ”ہاں خدا نہ کرے“ اور تو بالکل بدھو ہے قسم سے
 ٹھیک ہے دینا ابھی پڑھ رہی ہے تو اسے پڑھنے دو۔ میں
 یہ تو نہیں کہہ رہا کہ پاکستان جاتے ہی کھٹ سے شادی
 کر لو اور بھی جتنا عرصہ اسے تعلیم مکمل کرنے میں
 لگے گا تم اس عرصے میں بزنس سیٹ کر لینا کھڑے لینا
 اسے سجالینا اور جب وہ پڑھائی سے فارغ ہو جائے تو
 اس گھر کو سجالینا۔ لوجی اللہ، اللہ تے خیر صلا۔“ وہ تو پورا
 پروگرام ترتیب دے بیٹھا تھا میں نے بھی پر سوچ انداز
 سے سر کو جنبش دی۔

”ہوں پروگرام تو اچھا ہے سوچا جاسکتا ہے۔“
 ”سوچا جاسکتا ہے بلکہ سوچ لیا گیا ہے اور یہ ڈن
 ہو گیا ہے، ہم ایک ماہ کے اندر رخت سفر باندھ لیں گے
 اور پھر اپنا سونا دلیں ہوگا، ہم تم ہوں گے اور رخص
 میں سارا عالم ہوگا اور سوچو وہ گھڑیاں کیسی گھڑیاں ہوں
 گی جب بادولت سفید گھوڑی بر سوار، اور شہزادی
 مرانہ کھوٹھٹ نکالے ڈولی میں چھپی بیٹھی ہوگی اوہو
 ہو اوہ اوہ۔“ وہ مارے خوشی کے دیوانہ ہوتا بھنگڑا
 ڈالنے لگا ساتھ اس نے مجھے بھی کھما ڈالا میں اس کی
 دیوانگی پر ہنسانہ تو کیا کرتا۔

میرا ابھی پاکستان جانے کا کوئی ارادہ تو نہیں تھا مگر
 ہارون نے میری ایک نہ چلنے دی وہ میری ہر بات ہر
 دلیل رد کرتا گیا۔ میں سہانے سننے دیکھتا پاکستان جانے
 کی تیاری میں لگ گیا۔ اور پھر تو دن گزرنے کا پتا بھی نہ
 چلا اور وہ لمحہ بھی آن پہنچا۔ جب ہم نے نیویارک کی

بس اندھا دھند کام کرتے رہے ہو ایمان سے حدید اگر
 میں تمہاری جگہ ہوتا تو کب کا اپنے عہد سے پھر گیا ہوتا
 مگر یار یہ تم ہی ہو جو اتنی مشقت کے بعد بھی تازہ دم
 دکھائی دیتے ہو۔ تمہاری وفا تمہاری ہمت کو مان گیا
 ہوں یار تو واقعی ادینہ سے سچا پیار کرتا ہے اور میری
 بات مان تو اب بس کر بڑا امتحان لے لیا اپنا۔ اب تو یہ
 سوچو کہ اس کی اور اپنی خوشیوں کے لیے تمہیں کب
 پاکستان جانا ہے۔“

”پاکستان تو جانا ہے یہ بھی ٹھیک ہے میں اب آتا
 گیا ہوں مگر پھر سوچتا ہوں کہ ابھی۔“
 ”اب بس کر لگے، بہت کما لیے ڈالر، اتنا تو جمع کر لیا
 ہے تو نے کہ ادینہ کے خوابوں جیسا اک سچا سچا گھر اور
 اس گھر کے پورچ میں لاش ہنسی کرتی گاڑی اور اس
 گاڑی کی ڈرائیونگ سیٹ پر سوئڈن بونڈ تم اور تمہارے
 ساتھ ”بنی سنوری دینا“ آبا گیا تصویر ہے اور اس تصویر
 میں رنگ بھرنے کے لیے تمہیں خود پاکستان جانا
 پڑے گا۔“

اور سنو کل امی کا بھی خط آیا ہے انہوں نے لکھا
 ہے کہ سب میری شادی کے لیے دعا گو ہیں اور یہ کہ
 سب کا ارمان ہے کہ یہ شادی پاکستان میں ہو۔ اور
 رات کو انکل سے میری بات ہوئی ہے مزے کی بات
 ان کی بھی یہی خواہش ہے وہ بھی کئی برسوں سے
 پاکستان نہیں گئے اپنے لوگوں سے نہیں ملے وہ چاہتے
 ہیں کہ مرانہ کی شادی پاکستان میں کریں تاکہ سب
 اپنوں کے درمیان اس خوشی کو محسوس کر سکیں۔“ یہ
 بتاتے ہوئے ہارون کا چہرہ اندرونی مسرت سے جگمگانے
 لگا۔

”اوہ، بہت بہت مبارک ہو یار۔“ میں نے بے
 پایاں خوشی سے اسے گلے لگالیا۔
 ”تو اس کا مطلب ہے اب تم پاکستان جانے کی
 تیاری کرو گے۔“

”بالکل اور صرف ہم ہی نہیں تم بھی ہمارے ساتھ
 چلو گے سمجھے میں اب مزید تمہیں مجنوں کا جانشین بننے
 ہوئے نہیں دیکھ سکتا۔“ ہارون کے لہجے میں میرے



جوں جوں ہم اپنی منزل کے قریب پہنچ رہے تھے
— رگوں میں دوڑتے لہو کی گردش تیز تر ہو رہی
تھی اپنے وطن واپسی کا خوش کن خیال۔ اپنی نضاؤں
میں سانس لینے کی تمنا اپنوں سے ملنے کی خوشی اپنے
خوابوں کے پورا ہونے کی امید۔ نیویارک سے پاکستان
تک اکیس گھنٹوں کا سفر میں نے انہی خیالوں کے سنگ
ملے کیا۔ اور جناح ٹرمینل پر جہاز کے اترتے ہی میرا
بس نہیں چلا کہ جہاز کے اترنے سے پہلے ہی چھلانگ
لگا کر اتروں اور دوڑتا ہوا گھر پہنچ جاؤں۔

ایئر پورٹ پر مجھے لینے کے لیے کوئی آنے والا نہیں
تھا کیونکہ میں نے کسی کو اطلاع ہی نہ دی تھی ہاں
ہارون کا پورا خاندان وہیں اٹھ آیا تھا اسفند انکل اتنے
عرصے بعد وطن واپس آئے تھے ان کا شاندار استقبال
ہونا تو لازمی تھا وہ لوگ ادھر مصروف ہوئے تو میں نے
ایک کوچھوڑ کر دوسرے اور دوسرے کے بعد میرے
سے ملتے ہارون کو پکڑ کر جانے کی اجازت چاہی۔

”تمہیں جلدی کس بات کی ہے ہمارے ساتھ چلو
کچھ ریسٹ کر کے کھانا کھا کر پھر فریش ہو کر چلے جانا۔“
اس نے مشورہ دیا اور میں نے نفی میں سر ہلا دیا۔
”تو میرے کھانے کی فکر نہ کر کھانا اب میں گھر جا کر
امی کے ہاتھ کا ہی کھاؤں گا بس میں چلتا ہوں۔ کل
ملاقات ہوگی ٹھیک ہے نا۔“ اسے مزید کچھ بولنے کا
موقع دیے بغیر زبردستی مصافحہ کرنا میں جلدی سے نکل
آیا۔ مبادا انکل ہی نہ روک لیں۔

جلدی ہی ٹیکسی مل گئی تھی اور میں اپنے جانے
پہچانے راستوں پر رواں دواں تھا تمام راستے میں
خیالوں ہی خیالوں میں متوقع لمحوں کی حسن آفرینی سے
حفظ اٹھاتا رہا حتیٰ کہ وہ لمحے بھی اُن پہنچے جب میں اس
پارے سے گھر کے سامنے کھڑا تھا۔ ٹیکسی رکوا کر
احساس ہوا کہ میں اپنے نہیں ماما جی کے دروازے کے
آگے ہوں اپنی گھبراہٹ بو کھلا ہٹ سے محفوظ ہوتے

اس وقت جو میرے دل کی حالت تھی میں اسے
لفظوں میں بیان نہیں کر سکتا۔ بے پناہ خوشی کے
باعث میرا چہرہ لودے رہا تھا۔ دھڑکنیں منتشر لڑتا
ہاتھ جو میں نے دستک دینے کے لیے دروازے پر رکھا تو
وہ آپ و آپ یوں کھلتا چلا گیا جیسے اسے میرے آنے
کی پہلے سے خبر ہو۔ میں نے دھڑکتے دل سے دہلیز پر
قدم رکھا۔ سوٹ کیس تھپیٹ کر اندر کیے۔

”حد ہو گئی اتنی دیر صارم تم کوئی کام وقت پر۔“
ایک لخت تیز تیز بولتی وہ کچن سے نکلی تھی اور مجھ پر نظر
پڑتے ہی گنگ ہو گئی منہ کھلے کا کھلا رہ گیا۔ میں اپنی جگہ
ساکت ہو گیا۔

اس چہرے کی دید کو کتنا ترسی تھیں میری آنکھیں
کتنے دن، کتنے مہینے کتنے سال میں نے اس گھڑی کا
انتظار کیا تھا۔ کسے کیسے رگوں میں سو جاتا تھا میں اور
آج جب اسے دیکھا تو لگا کہ میرے گزشتہ سالوں کی
تھکن اس سے دوری کا بن باس اپنوں سے جدائی کی
تڑپ، ساری تکلیفیں، اذیتیں سب دور ہو گئی ہوں
مجھے جیسے میرے حوصلے اور صبر کا انعام مل گیا ہو۔ میں
سکرا دیا وہ یوں اچانک مجھے دیکھ کر خوب حیران بھی
ابھی چند روز پہلے ہی تو میں نے اس سے بات کی تھی
اور اسے بتایا تھا کہ ابھی مزید ایک سال تک میرا واپسی
کا کوئی ارادہ نہیں۔

”حد۔ حد۔ حد۔ حد۔“ اسے ہوش آہی گیا تھا وہ
تیر کی سی تیزی سے مجھ تک آئی میرا بازو تھام کر گویا
میرے ہونے کا یقین کیا اور اس کی اس بے اختیاری پر
میں سر سے پیر تک شانت ہو گیا۔

”جی ہاں میں کیسی ہو؟“ میں نے ہینڈ بیک پیچ صحن
میں رکھا اور نرمی سے اس کا ہاتھ تھام لیا۔

”آپ تمہیں یقین نہیں آ رہا۔ یوں اچانک آگئے
تم نے اپنے آنے کی اطلاع نہیں دی بتایا کیوں
نہیں۔“ وہ تجھیو مسو سی بے ربط ہو رہی تھی میں ہنس
دیا۔

”دیرینہ ذرا سانس تولو۔ سب بتاتا ہوں۔“

”افوہ اماں، پھوپھو دیکھیں تو کون آیا ہے ذرا باہر تو آئیں۔“ اس نے یکدم چیخ کر سب کو مطلع کیا۔ اس کی ایک ہی پکار پر اماں اور امی افان و خزاں اندر سے دوڑی آئیں۔

”خیر تو ہے کون آگیا؟ اے حدید میرا بچہ میری جان۔“ امی کی خوشی دیدنی تھی۔

میں لپک کر ان سے لپٹ گیا۔ کتنا ترسا تھا میں اس بار کے لیے اس چہرے کو دیکھنے کے لیے، تھک کر ان کی گود میں سر رکھ کر سونے کے لیے۔ ان کی ترسی مامتا بھی مجھے یوں سامنے پا کر بے قرار ہو گئی تھی انہوں نے چٹا چٹ مجھ پر بوسوں کی بوچھاڑ کر دی۔ آنکھوں سے آنسو بہ رہے تھے میری ہلکی بھیگی گئیں۔

”آئے ہائے اب جھوڑ بھی دے مجھے تو ملنے دے اپنے بچے سے۔“ اماں کی بے تابی پر ہنستا میں ان کے کھلے بازوؤں میں سما گیا۔

”میں صدقے میں واری، میرا بچہ میری تو آنکھیں ترس گئیں۔“ مجھے دیکھنے کو ہائے اتنے سال اللہ جانتا ہے کیسے گزارے ہیں ہم نے اب تو واپس نہیں جائے گا تا میرا بیٹا۔“ ان کے پیار میں فکر گھلی تھی۔

”نہیں، میں جانے کے لیے تو نہیں آیا، میں آگیا ہوں واپس ہمیشہ کے لیے اپنی اماں جان کے پاس۔“ میں نے ان کے ہاتھ چوم لیے۔

”اوہ یہ میں کیا دیکھ رہا ہوں حدید بھائی میرا جگر میرا یار۔“ صادم باہر سے آ رہا تھا ہاتھوں میں پکڑے شاپر اس نے چارپائی پر اچھالے اور میرے گلے آگے۔ میں نے بھی اسے سینے میں بھینچ لیا اس کی شرارتوں کو اس کی باتوں کو کتنا مس کیا تھا میں نے۔

”ف آپ تو اس ہی کر گئے تھے ہمیں، مت پوچھیں ہمارا حال اور یہ کیا آپ اتنی دور سے اکیلے آئے ہیں؟“ وہ مجھ سے الگ ہوا، میرے پیچھے دائیں بائیں نظر دوڑائی۔

”نہیں، اکیلا تو نہیں آیا، ہارون اور انکل اسفند کی فیملی ساتھ آئی ہے۔“ میں نے ساوگی سے جواب دیا۔ وہ قہقہہ مار کر ہنس پڑا۔

”تتا عرصہ امریکہ میں گزارنے کا کیا فائدہ ہوا آپ تو ابھی تک ویسے ہی بھولے ہو میرے بھائی۔ میں تو کسی میم شیم اپنی کسی بھابھی شالی کا پوچھ رہا تھا وہ ساتھ نہیں آئیں۔“ اس کی آنکھوں میں شرارت تھی۔

”چل ہٹ کیسی فضول باتیں کرتا ہے، میرا بیٹا ایسا نہیں ہے مجھے اپنے بچے پر بھروسہ تھا تو اتنی دور جانے دیا تھا ورنہ کبھی نہ جانے دیتی اگر تیرے جیسا ہوتا تو۔“ اماں نے اسے ایک دھپ لگا کر میرے سر پر ہاتھ پھیرا۔ میں مسکراتا ہوا لاڈ سے ان کے کندھے سے لگ گیا جبکہ صادم تڑپ اٹھا۔

”کیا مطلب، اگر میرے جیسا ہوتا تو۔“

”اماں مذاق کر رہی ہیں اتنا سفر کر کے آیا ہے میرا بیٹا تھک گیا ہو گا کیا پیس کھڑے کھڑے ساری باتیں کر لیتی ہیں چلو حدید اندر آؤ بیٹا۔ صادم تم یہ سامان بھی کمرے میں رکھ دو اور چھوٹی فٹ ٹھنڈا پانی بنا کر لاؤ۔“ امی میرا بازو پکڑے ہوئے بولیں اور میری جو اس پر نظر گئی تو حیران رہ گیا وہ دوپٹے کے پلو سے آنکھیں رگڑ رہی تھی۔ قبل اس کے کہ میں کچھ کہتا وہ پلٹ کر کچن میں جا گئی، امی مجھے اک سجے سجائے صاف ستھرے کمرے میں لے آئیں۔

”وہی باحول، وہی فضا، وہی آسودگی، بخشی ہوا آئیں، وہی آئین، وہی پھولوں کی بھیننی بھیننی باس، وہی آسمان، وہی ستارے، وہی سب میرے اپنے میں تو جتنا بھی مسرور ہوتا کم تھا۔“ میرے آنے کی اطلاع اباجی اور ماما جی تک بھی پہنچ گئی تھی۔ اور وہ فوراً گھر آگئے تھے اور جن کے سینے سے لگتے ہی میں کتنا سکون ہو گیا تھا کلمہ آیا اور ماندہ بھی اپنے اپنے شوہر اور بچوں کے ساتھ آگئیں۔ اور دونوں تکتی اچھی لگ رہی تھیں اپنے ننھے منے بچوں کی شرارتوں پر ابھتی فکر مند ہوتی۔

”چھوٹی ذرا گڑیا کو دکھنا۔ بار بار سیڑھیاں چڑھ اتر رہی ہے کہیں گر ہی نہ جائے ایک تو اس کے چھلانگیں لگانے کے شوق سے بڑی تنگ ہوں میں۔“ منع کرنا اسے۔ ”آپانے دینا کو دوڑایا۔“

”چھوٹی منے کا بھی خیال رکھنا کہیں پھسل نہ جائے

نیا نیا چلنا سیکھا ہے گر جاتا ہے۔ ”مانہ کو اپنے بیٹے کا خیال تھا۔

”چھوٹی عمر کا فیڈر دھو کر تازہ دودھ ڈال کر لانا۔“ آپا نے اسے آواز دی۔

”اور نہ بیٹا، ذرا بھاگ کے ہنڈیا دیکھنا میں بھول ہی گئی، کہیں سائلن لگ ہی نہ جائے۔“ یہ امی کا حکم نامہ تھا۔

اور میں نے دیکھا چھوٹی بھاگ بھاگ کے سارے کام کر رہی ہے۔ بچوں کا خیال بچن کی دیکھ بھال اس کے ماتھے پر اک سنگن نہیں تھی۔ انتہائی مصروف انداز میں وہ اک اک حکم بجالا رہی تھی۔

مجھے یاد تھا وہ کوئی کام کرنا پسند نہیں کرتی تھی اسے خود سے اٹھ کر پانی پینا بھی برا لگتا تھا اپنے لیے چائے کا ایک کپ بنانا بھی اسے گوار نہ ہوتا تھا اسے چولہے کی گرمی سے الرجی تھی۔ اک بار مارے لگاؤ کے اس سے میں نے چائے کی فرمائش کر دی تو اس نے صاف کورا جواب دے دیا تھا اور اب میں جان بوجھ کر اس سے تین بار چائے بنا چکا تھا اور اس نے ایک بار بھی انکار نہیں کیا تھا۔ بلکہ دو منٹوں میں کپ لیے آن حاضر ہوتی میری حیرت بجا تھی اسے ادھر ادھر بھاگتے دوڑتے میں متحیر سا دیکھ رہا تھا۔ اس کی شخصیت میں — کتنا وقار آگیا تھا۔ وہ پہلے سے بھی زیادہ خوبصورت ہو گئی تھی۔ اس کا وہ بھولا بھالا چہرہ کیسا برتر مکتنت ہو گیا تھا کہ میری نظریں بار بار اس کا تعاقب کر رہی تھیں۔

امی کا کلمہ آپا اور مانہ میرے پاس بیٹھیں تو سب بھول گئیں دینا نے ہی تن تنہا کھانا بنایا، دسترخوان بھی اکیلے ترتیب دیا۔ اور جب وہ سب کو بلانے آئی تو میں اسے کن انکھیلوں سے دیکھتا شرارتاً ”صارم سے کہنے لگا۔

”یار میں جاتے ہوئے یہاں اک ضدی کام چور“ تنکھے مگر نازک مزاج والی لڑکی کو چھوڑ گیا تھا وہ مجھے باہر جا کر بھی بہت یاد آتی رہی اور اب میں اک عرصے بعد واپس آیا ہوں مگر وہ مجھے کہیں نظر نہیں آرہی ذرا ڈھونڈنا تو اسے میں اس سے ملنے کو بڑا بے تاب

ہوں۔“

”ہیں کون سی لڑکی۔“ صارم شاید سمجھا نہیں تھا لیکن دینا کے لبوں پر مدھم مدھم مسکان بکھر گئی۔ وہ میرا اشارہ سمجھ چکی تھی۔

”چلیں انھیں کھانا ٹھنڈا ہو جائے گا۔“ وہ بچوں کے پھیلانے کشن سمیٹتی ہوئی بولی۔

”نہ مجھے تو بھوک نہیں ہے۔“ میں گاؤ تنکیہ کھینچ کر پشت کے نیچے رکھتا نیم دراز ہو گیا۔

”کیوں“ وہ سیدھی ہوئی تو آنکھوں میں تشویش تھی۔

”بھئی تم نے تین بار مجھے اس قدر اچھی چائے پلائی ہے کہ اب میرا کھانے کو دل ہی نہیں چاہ رہا۔“

”ارے ارے حدید بھائی اس وقت کھانے سے انکار مت کیجیے۔ آپ نہیں جانتے کہ چھوٹی کتنا اچھا کھانا پکاتی ہے۔ اس کے ہاتھ کے بنے چکن ہرے مسالے اور بریانی کا تو جواب نہیں۔ میں تو جب بھی آتا ہوں خاص طور پر فرمائش کر کے چھوٹی سے کھانا پکواتا ہوں اگر آپ کو بھوک نہیں ہے تب بھی کھا کر دیکھیے انگلیاں نہ چاٹتے رہ جائیں تو کہیے گا۔“ ٹالوں سے ہاتھ پونچھتے اندر آتے مانہ کے شوہرا سر نے جس طرح اس کی تعریف کی میری حیرانی دوچند ہو گئی۔

”یار یہ کیا کیا پلٹ ہوئی ہے میرے پیچھے دینا اور اتنی گھڑ آئی ڈوٹ بلی اسٹ۔ کیوں دینا یہ تبدیلی کیسی؟“ میں نے اسے دیکھا۔

”ارے یہ تو کوئی تبدیلی نہیں ہے حدید بھائی آگے آگے دیکھیے۔ یہ اپنی چھوٹی بہت اچھی بچی بن گئی ہے۔“ صارم ہنس دیا۔

”کیا مطلب بھئی بن گئی ہے اپنی چھوٹی ہے ہی بہت اچھی بچی۔“ یا سر بھائی نے اس کا سر تھپکا وہ چپ چاپ کمرے سے نکل گئی۔

”ایک اور مزے کی بات اس کی ایک اور خوبی بتاؤں یہ پہلے کی طرح ہر بات کا تو تڑاخ سے جواب دینے کی بجائے اب چپ ہو جاتی ہے۔“ صارم مجھے بتا رہا تھا۔

”دیری گڈ“ یہ تو بہت اچھی بات ہے، اماں تو خوش

ہوں گی۔“ میں مسکراتا ہوا صارم اور یا سر بھائی کی ہمرہی میں دوسرے کمرے میں آگیا۔ یہاں فرش پر بچھائی گئی چاندنی پر نفاست سے کھانا چٹا ہوا تھا۔ ”او، آؤ بیٹا، یہاں بیٹھو میرے پاس۔“ ملا جی نے میرا ہاتھ پکڑ کر اپنے ساتھ بٹھالیا۔ کھانا واقعی بہت مزے کا تھا یا سر بھائی نے سچ کہا تھا۔

میں نے کھانے کے دوران دینا کو خوب داد دی۔ سب ہی تعریف کر رہے تھے اور وہ ہلکی سی مسکراہٹ سے سب کی مدح سمیٹ رہی تھی۔ کھانے کے بعد میرا ارادہ تھا کہ میں سب کے لیے لائے گفتگو ان کے حوالے کروں۔ لیکن اماں نے مجھے سختی سے تاکید کی اب آرام کو باقی کام بعد میں۔ سب نے بھی ان کی ہاں میں ہاں ملائی تو میں نے بھی سر ہلا دیا۔ یوں بھی دو راتوں سے مارے بے فراری کے میں سو نہیں پایا تھا اب چین ملتے ہی نیند آنے لگی تھی اور میں شدت سے اپنے پرسکون بستر کی ضرورت محسوس کر رہا تھا سو سب کو سب بخیر کھتا میں اٹھ کھڑا ہوا۔



”نہایت ہی جھوٹی لڑکی ہو تم، جب میں دور تھا تو ہر خط میں اداسی کے رونے روئی تھیں ہر بار پوچھتی تھیں کہ پاکستان کب آوے گا؟ اور اب جبکہ میں آگیا ہوں تو تمہارے پاس میرے لیے وقت ہی نہیں ہے میں کب سے منتظر ہوں کہ تم دو گھنٹی میرے پاس بیٹھو مجھ سے باتیں کرو مگر تم ہو کہ تمہیں ان اونٹوں کے بونگے کاموں سے فرصت نہیں۔“ میں کب سے اس کی راہ دیکھ رہا تھا مگر وہ تھی کہ اس کے کام ہی ختم ہونے میں نہیں آرہے تھے کوئی گھنٹہ بھر پہلے وہ مجھے دو منٹ میں آئی کہہ کر جو گم ہوئی تو واپس پلٹنے کا نام نہیں لیا تھا آخر کار صبر کا پیمانہ پھٹکتے ہی میں خود اسے تلاشتا پن میں جا پہنچا۔ وہ انتہائی محویت کے ساتھ روٹیاں پکانے میں مگن تھی۔ میں اس کی یہ مصروفیت دیکھ کر جل بھن ہی ٹوگیا۔

”اوہ، سوری پلیز ناراض نہ ہوں مجھے احساس ہے

میں تو خود آپ سے بہت سی باتیں کرنا چاہتی ہوں مگر کیا کروں یہ کام اچھا آپ اندر جا کر بیٹھیں میں بس ابھی آئی۔“ آستین سے ماتھے کا پیمینہ پونچھتے وہ جس لمحے میں بولی میں بے ہوش ہوتے ہوئے بچا بمشکل اپنے حواس یکجا کرتے ہوئے میں نے اپنے آس پاس دیکھا۔ ”دینا یہ کسی سے باتیں کر رہی ہو تم، آنکھیں کھول کر دیکھو یہ میں ہوں حدید۔ جو تم سے عمر میں بے شک پانچ سال بڑا ہے مگر جس کی اس بڑائی کو تم نے کبھی قابل اعتنا نہیں جانا ہمیشہ تم مجھ سے جس انداز اور بے تکلف لمحے میں بات کرتی رہی ہو تا تو پلیز اب بھی مجھ سے اسی طرح بات کرو یہ آپ آپ کے تکلف میں کیوں پڑ رہی ہو کہ مجھے غیریت کا احساس ہونے لگے۔ یا صارم ذرا اوھر آنا دیکھنا تو اسے کیا ہو گیا۔“ میں نے پاس سے گزرتے صارم کو آواز دی جو کندھوں پر ٹاول ڈالے واش روم کا رخ کر رہا تھا میرے بلانے پر تھہرا کر پلٹا۔

”کسے کیا ہو گیا ہے۔“ اس کے استفسار پر جب میں نے دینا کا طرز گفتگو بتایا تو وہ حصن ہاتھ باندھ کر کھڑا ہو گیا۔

”بھائی جان اس میں چھوٹی کا کوئی قصور نہیں۔ ہم ٹھہرے غریب بندے، مظلوم پاکستانی اور آپ ماشاء اللہ امریکہ کی سڑکیں پیروں تلے روند آئے ہیں اب ہم آپ سے آپ کر کے بات نہ کریں تو پھر کیا کریں۔“

”تو بھی اپنے نام کا ایک مسخرہ ہے جایا را اپنا کام کر۔“ میں نے ہنستے ہوئے اسے ایک ہاتھ رسید کر دیا۔ دینا کے لبوں پر بھی مسکان کی کلی چٹنی تھی۔

”کھانے میں کتنی دیر ہے چھوٹی میں ہاتھ روم جا رہا ہوں نما کر آؤں تو مجھے کھانا تیار ملنا چاہیے۔“ صارم اس سے کتا اوھر مڑ گیا۔ اس کے ہاتھ تیزی سے چل رہے تھے میں سینے پر ہاتھ باندھے دروازے سے لگ کر کھڑا ہو گیا۔

”بس یہ دو روٹیاں رہ گئی ہیں یہ ڈال لوں پھر میں آتی ہوں۔ اندر۔۔۔ جائیں بہت گرمی ہو رہی ہے

یہاں۔ ”وہ بڑی فکر مندی سے کہہ رہی تھی۔
 ”تو کوئی بات نہیں تم بھی تو کھری ہو یہاں۔“ میں
 نے دیوار سے نیک لگائی۔ اس کا چہرہ پیٹنے سے بھیگ رہا
 تھا آگ کی تپش سے دیکھتے رخسار بالوں کی چند شریر
 لٹیں ماتھے پر چپکی ہوئی تھیں۔ وہ مجھے ہر روپ میں
 اچھی لگتی تھی اب بھی اس کا بھیگا بھیگا چہرہ مجھے ہریار
 سے زیادہ اچھا لگا۔

”میں تو عادی ہوں اس گرمی کی اتنی تو گرمی پڑتی ہے
 پاکستان میں۔ امریکہ میں تو اتنی گرمی نہیں ہوتی نا۔“ وہ
 بڑے بھولپن سے پوچھ رہی تھی۔

”ہاں کیونکہ ہر طرف سے پہاڑوں میں جو گھرا ہوا
 ہے امریکہ۔ سارا سال برف باری ہوتی ہے وہاں۔
 ارے پاگل لڑکی وہاں بھی گرمی پڑتی ہے۔ سردی گرمی
 سارے ہی موسم ہیں وہاں۔ اور تھوڑا سا پات کو تم یہ
 بتاؤ تم یہ کیا کر رہی ہو۔ یاد ہے تم کہا کرتی تھیں کہ
 میں تو شہزادی ہوں اور شہزادیوں کو یہ عام عورتوں والے
 کام سوٹ نہیں کرتے میں عورت پر لازم و ملزوم
 ٹھہرائے جانے والے یہ کام کبھی نہیں کروں گی میں تو
 ملازما میں رکھوں گی جو چنگی بجاتے میرا ہر حکم بجا
 لائیں تو اب کیا ہوئے تمہارے وہ پلان۔“ میری بات
 پر اس کے مسکراتے ہونٹ سکڑ گئے تھے۔

”ہاں کہتی تو تھی پاگل جو تھی اور ضروری تو نہیں کہ
 جو ہم چاہیں وہ پورا بھی ہو۔“

”ہو سکتا ہے پورا کیوں نہیں اگر ہم یقین اور قوی
 امید رکھیں۔ تم شہزادی ہو اور شہزادی بن کے رہو۔
 اب کوئی ضرورت نہیں یہ سارے کام کرنے کی۔“
 ”کیوں کیا آپ میری جگہ یہ سارے کام کریں
 گے۔“

”پھر وہی آپ! میں سنجیدگی کے ساتھ کہہ رہا ہوں
 انسان بن جاؤ دینا۔“ میں نے گویا دانت کچکچائے۔
 ”اب جلدی سے یہ سب کام سمیٹ کر کچھ ٹائم
 مجھے دے دو ورنہ میں تمہارا سب کیا کرانا تلپٹ کر کے
 رکھ دوں گا سمجھیں۔“ میں پیار بھری خفگی سے اسے
 وارن کرتا کچن سے نکل کر اس کے روم میں آ گیا۔

یہ کمرہ پہلے آیا، مائہ اور اس کا مشترکہ ہوا کرتا تھا اور
 اب ان دونوں کے بعد یہاں صرف دینا کی اجارہ داری
 تھی جو اس کے اعلا فوق کی مظہر تھی۔ صاف ستھرا
 با ترتیب کمرہ، فرش پر سادہ نیلا کارپٹ، بچھا تھا کونے میں
 سنگل بیڈ اس سے کچھ فاصلے پر دو کرسیاں رائٹنگ
 ٹیبل ساتھ ہی کتابوں سے بھری بک شیلف تھی۔
 دائیں طرف ایک الماری، بیڈ کی سائڈ وال پر ایک
 خوبصورت پینٹنگ آویزاں تھی جس سے کچھ پرے
 سرخ و سفید موتیوں سے بنا وال ہینگنگ اور یونہی
 جائزہ لیتے میری نظر نازک سے فریم میں قید دینا کی ہستی
 مسکراتی تصویر پر جا ٹھہری یہ تصویر یقیناً ”یونیورسٹی کی
 کسی تقریب میں اتاری گئی تھی لائٹ پنک امیر اینڈ
 سوٹ میں اس کا معصوم حسن کتنا دلربا لگ رہا تھا
 میں تو کئی لمحے مبہوت سا اس تصویر کو دیکھتا رہا میرے
 انہماک کو کھڑکی سے اندر آتے ہوا کے شریر جھونکے
 نے توڑا جس سے رائٹنگ ٹیبل پر بکھری کتابوں کے
 اوراق پھڑپھڑائے تھے۔

میں چونک کر اس طرف چلا آیا ٹیبل پر بڑی کتابوں
 کے ساتھ کچھ میگزین تھے جن کی طرف جانا میرا ہاتھ
 ان ہی کے درمیان رہی میروں جلد والی ڈائری تک جا
 رکامیں نے بلا ارادہ اسے اٹھا کر کھول لیا۔ گوکہ کسی کی
 ڈائری بلا اجازت پڑھنا غیر اخلاقی حرکت قرار پاتی ہے
 لیکن یہ کسی اور کی تو نہیں دینا کی ڈائری تھی سو یہی سوچ
 کر میں نے اطمینان سے پھلے ورق پر نظر ڈالی سیاہ
 روشنائی سے اک غزل تحریر تھی میں نے کرسی سیدھی
 کی اور مزے سے بیٹھ گیا۔

کوئی دیوار ہے نہ درسا میں
 ہم فقیروں کا کیا ہے گھر سا میں
 آبلے بڑ گئے ہیں پیروں میں
 ختم ہونا نہیں سفر سا میں
 کون رہتا ہے اس خرابے میں
 ڈھونڈتی ہے کسے نظر سا میں
 اک قامت گزر گئی مجھ پر
 اور مجھ کو نہیں خبر سا میں

کردی۔ چابی کھینچ کر نیمل کور کے نیچے کھسکادی اور تیز تیز بولتے ہوئے گویا اپنی نعت مٹانے لگی میں نے بھی اپنے تئیں نقوش ڈھیلے کیے۔

”اس لیے تو کہا ہے کہ خود کو اذیت دینے والے کام نہ کرو کیا ضروری تھا اپنی گرمی میں جلتے کھانا پکانا بازار سے منگو الیتیں اتنے ہونٹ کس لیے ہیں بھلا اور اس جو اس کی ضرورت مجھے نہیں تمہیں ہے چلو بیٹھو ادھر اور یہ پو۔“ میں نے ایک ہاتھ سے پکڑ کر اسے بٹھایا اور دوسرے سے مہنگو جو اس کا گلاس اور اس کے نہ نہ کرنے کے باوجود اسے پلا کر ہی دم لیا۔

”تنتا کام کرتی ہو اور اپنا خیال بالکل بھی نہیں رکھتی ہو میں دیکھ رہا ہوں خود سے بہت لاپرواہ ہو گئی ہو۔ تم بہت بدل گئی ہو دیکھو مجھے لگ رہا ہے۔“ میں نے اس سے پوچھا۔

مجھے اس کی ایک بات یاد تھی اسے اپنی ذات سے پیار تھا اپنے خوابوں سے عشق اپنے آگے تو وہ کسی اور کو اہمیت دینے کی قائل ہی نہ تھی وہ بچپن ہی سے اپنی شخصیت کو سنوار کر رکھنے کی عادی تھی ہمیشہ تک سک سے درست بڑی نفیس طبیعت پائی تھی اس نے جبکہ اب میں اسے وہی دودن پرانا سوٹ پہنے دیکھ رہا تھا، شگن آؤ اور ملگجاً لگتا تھا کنگھا کیے بھی زمانہ گزر گیا ہے ابھی کچھ ہی اشوں کے درمیان اس کا زرد ستا چرو۔

ماتہ اور کاملہ آیا بھی یہیں تھیں اور مجال ہے جو دونوں اٹھ کر پانی بھی پیتی ہوں ہر ہر کام کے لیے سارا دن چھوٹی، چھوٹی کی پکار پڑی رہتی اور وہ بھی ایسی فرماں بردار ہر پکار پر لبیک کہتی۔ میں دیکھ دیکھ کر حیران ہو رہا تھا اور اب اس کے چلے پر غور کیا تو کس گیا۔ وہ سر جھکا گئی تھی مجھے غصہ آگیا۔

”خبردار جواب تم نے کسی کام کو ہاتھ لگایا میں آج ہی ای سے کہہ کر کسی میڈ کا بندوبست کروانا ہوں۔ تم نے تو خود کو بلکان کر لیا ہے ذرا اپنی آپاؤں کو بھی ہٹنے جلنے دیا کرو تم جیسی چار چار نکل آئیں۔ جتنی وہ صحت مند ہیں اور تم ہو کہ حل سے بے حال ہوئی ہو گئی آئینہ دیکھو کتنے روز گزر گئے تمہیں۔ سارے کاموں

ایک بھٹکے ہوئے مسافر کو اور ہونا ہے در بدر سائیں اللہ رحم کرے۔ یہ کس طرح کی شاعری لکھ رکھی ہے دینے میں نے صفحہ پلٹا اک قطعہ درج تھا۔

دھوکے کھا کر مجھ کو یہ معلوم ہوا چاہ کا عنصر دنیا سے معدوم ہوا کل کا دن اس الجھن کو سمجھائے گا میں تجھ سے یا تو مجھ سے محروم ہوا ہیں یہ کیا ہو گیا ہے دینا کو۔ میں نے اگلا صفحہ پلٹا اور اسی پل وہ آئی تھی۔

”ہائے میری ڈائری“ میرے ہاتھوں پر نظر پڑتے ہی وہ چیخی۔ اس نے بڑے تمام رکھی تھی جو جلدی سے نیمل پر رکھ کر میری جانب لپی۔ میں نے بھی جھٹ ڈائری اس کی پہنچ سے دور کر لی۔

”سوری فرزند تمہاری ڈائری بڑھنے کے جرم کا مرتکب ہوا لیکن دینا یہ تو بتاؤ یہ کس قسم کی باؤسانہ اور فضول شاعری لکھ رکھی ہے تم نے یہ دیکھو۔“ میں ڈائری سامنے کیے با آواز بلند پڑھنا چاہتا تھا کہ اس نے اچکل۔

”بہت، بہت زیادہ غلط بات ہے کسی کی پرستل چیزوں کو بلا اجازت ہاتھ نہیں لگاتے پتا ہے نا۔“ اس کا چہرہ ہی نہیں لہجہ بھی انتہائی براہم ہو گیا تھا اس سے پہلے بھی اس نے مجھ سے اس انداز میں بات نہیں کی تھی۔ میں نگاہ حیران اس کے تنے چہرے پر ڈالتا کھڑا ہو گیا۔

”سوری“ مجھے علم نہیں تھا کہ اتنے عرصے میں تم میرے لیے کسی ہو گئی ہو آئندہ احتیاط برتو گاسوری آئیں۔“ میں بھی یکدم سنجیدہ ہو گیا تو وہ بوکھلا گئی۔

”افو میرا یہ مطلب نہیں تھا اور حد ہے میں اسے باہر کیسے بھول گئی اور آپ کھڑے کیوں ہو گئے بیٹھیں نا۔ اچھا یہ لیں جو س۔ کھانا ابھی لگاؤں کہ ذرا ٹھہر کے آج گرمی بہت ہے اف میرا تو حشر ہو گیا آنکھ کی اسپڈ تیز کر دوں تو بہ توبہ جانے یہ گرمی کب جان چھوڑے گی۔“ اس نے ڈائری دراز میں رکھ کر مقفل

کی فکر پڑی رہتی ہے ذرا خود پر بھی غور کر لو کیا ہو گیا ہے تمہیں دینا؟

”افوہ کچھ بھی تو نہیں ہوا مجھے۔ خواہ مخواہ پریشان نہ ہوں اچھا انھیں میں کھانا لگا رہی تھی۔ کھانا کھالیں اماں بھی آپ کا پوچھ رہی تھیں۔“ یونہی جھکے سر سے بولتے اس نے گلاس ٹرے میں رکھا اور اٹھنے لگی۔

”فی الحال مجھے بھوک ہے اور نہ تم کہیں جاؤ گی۔ اماں کو میں بتا آیا تھا کہ تمہارے کمرے میں ہوں۔ تم میرا ہیک لے آؤ جو اس روز میں ادھر چھوڑ گیا تھا۔“

”وہ تو ہمیں ہے وہ الماری میں ابھی لائی۔“ وہ اٹھ کر ہیک لے آئی۔ میں نے ہیک کھول کر پورا اس کے سامنے رکھ دیا۔

”یہ سب تمہارے گفٹس ہیں مگاہے بگاہے کسی نہ کسی موقع پر تمہارے لیے لیتا رہا تھا سب تو یاد نہیں ہاں یہ بمسلیٹ عید پر لیا تھا یہ پرفوم تمہاری برتھ ڈے پر یہ اپنی برتھ ڈے پر یہ شال کمرے پر یہ اس دن یہ اس دن۔“ مجھے جو یاد آتے گئے بتا کر لیا۔

”یا خدا یہ اتنے گفٹس میرے لیے۔“ اس کی دلنشین آنکھیں مزید کشادہ ہو گئیں۔

”جی ہاں جناب صرف آپ کے لیے پسند آئیں سب چیزیں۔“

”اف اتنا کچھ لانے کی کیا ضرورت تھی بس کوئی ایک آدھ چیز لے آتے وہی میرے لیے کافی ہوتی آپ نے تو فضول خرچی کی انتہا کر دی۔“

”اے اے لڑکی خبردار ان چیزوں کو فضول خرچی کہا تو۔ حد ہے تمہیں یہ چیزیں نظر آرہی ہیں ان میں چھپا میرا خلوص اور پیار نظر نہیں آ رہا۔ تم نے تو مجھے ڈس ہارٹ کر دیا ہے خوش ہونے کی بجائے حیران ہو رہی ہو۔ میں تو سمجھ رہا تھا کہ تم بہت خوش ہو گی آخر کو تمہارا کزن امریکہ سے آیا ہے بھی تم نے اپنی سیلیوں میں ٹور بھی تو بتائی ہو گی یاد ہے جب میں جا رہا تھا تو تم نے کیا کہا تھا؟“ میں اس کی وہ بات یاد کر کے ہنس دیا۔ اور اس نے پلکیں اٹھائیں تو سیاہ پتیلیاں جگمگا رہی تھیں۔

”یاد ہے سب یاد ہے۔ میں بھولی نہیں اپنی بے وقوفیاں۔ تب میں پاگل تھی ہر چمکتی چیز پر لپکنے والی۔ اب جان گئی ہوں کہ ہر شے سونا نہیں ہوتی۔“

”کیا مطلب؟“ مجھے تو اس کے لفظوں نے حیران کر دیا سمجھ داری کی باتیں اور ادب کے منہ سے۔

”کچھ نہیں اور تھینک یو یہ سب چیزیں اتنی خوبصورت ہیں اتنی اچھی یہ ہینڈ بیگ تو بہت زبردست ہے شال کا ٹکڑا کتنا پیارا ہے اور یہ فلاں روز تو میں اس کو نے میں لگاؤں گی یہ قلم کتنا نازک سا ہے اف آپ کی چوائس تو بہت فنٹانٹک ہے۔ میں حیران ہو گئی ہوں یہ اتنی چیزیں میرے لیے۔“ وہ ایک ایک چیز کو چھو کر خوش ہو رہی تھی۔

”میں میں اماں کو دکھاتی ہوں انہیں لے کر آتی ہوں۔“ وہ اٹھنے لگی میں نے ہاتھ پکڑ کر پھر بٹھالیا۔

”ابھی سمیٹو یہ سب پھر کسی وقت دکھا دینا اور یوں کرو جلدی سے تیار ہو جاؤ تم میرے ساتھ باہر جا رہی ہو پتا ہے دنیا میں وہاں تم سب کے ساتھ اپنے شریک سڑکیں بھی یاد کیا کرتا تھا اتنا دل چاہتا تھا کہ انہی سڑکوں پر گھوموں پھولوں اس بے فکری اور اپنائیت کے ساتھ جانتی ہو نیو یارک کے سڑکیں ہیں تو بہت خوب صورت لیکن وہاں مجھے ہمیشہ اجنبیت کا احساس رہا۔

یہی خیال ساتھ ہوتا تھا کہ یہ لوگ یہ راستے اپنے نہیں وہاں وہ موج ہے ہی نہیں جو یہاں ہے نہ آپ جو س پی کر خالی ڈبا سڑک پر اچھال سکتے ہیں نہ چپس کھانے کے بعد رہ پر میں ہوا بھر کر کسی کے آگے پٹاخہ پھوڑ سکتے ہوں نہ پتھر کو ٹھوکروں سے اڑا سکتے ہوں وہاں گول گپوں کے چٹخارے ہیں کیا ہے وہاں کچھ بھی تو نہیں مزا تو بس اپنے دیس میں ہے آج میرا دل چاہ رہا ہے میں اپنے راستوں پر چلوں خوب سیر کروں تم چلو گی نا میرے ساتھ۔“ میں نے ابھی تک اس کا ہاتھ تھام رکھا تھا اس نے آہستگی سے ہاتھ کھینچتے ہوئے اقرار میں سر ہلایا تو میں شادمان ہو گیا۔

اور وہ میری زندگی کی یادگار اور دلفریب شام تھی جو میں نے اس کی قربت میں گزاری۔ یونہی سڑکوں پر

گھومتے اس سے باتیں کرتے، گزرے دنوں کی یادیں دہراتے، ساحل سمندر کے کنارے اس کے ہم قدم چلتے اس کے سنگ آئیں کریم کھاتے میرے لیے اس شام کا اک اک لمحہ مسور کن تھا اور اسی فسون میں کھوئے میں نے دینا کے سامنے اپنا دل کھول کر رکھ دیا تھا وہ بات جو میں اس سے کبھی نہ کہہ پایا اس شام ہلا جھجک کہتا چلا گیا۔

اپنے جذبات، محسوسات اپنا ہر خیال وہ یقیناً حیران بھی سر جھکائے سن رہی تھی شاید ایسا اس کے گمان میں نہ تھا وہ بالکل چپ کر گئی تھی چہرے پر سرخی پھیل رہی تھی، پلکیں لرز رہی تھیں اور میں پہلی بار اس کا محبوب روپ دیکھ کر مسرور ہو رہا تھا۔

”واپسی پر میں اسے پاروں کی طرف لے آیا وہاں حسب توقع خوب رونق ملی ہوئی تھی اب چند دن ہی تو رہ گئے تھے اس کی شادی میں۔“

”آہا، حدید بھائی۔“ مجھے دیکھتے ہی افزائے نعرہ بلند کیا تھا۔

”شکر ہے ہیرو، تیری شکل بھی نظر آئی ورنہ میں تو یہی سمجھنے پر مجبور ہو گیا تھا کہ میں تجھے وہیں چھوڑ آیا ہوں۔“ ہارون بے تابی سے میرے گلے آگیا۔

”یہ غالباً“ نہیں یقیناً“ اویںہ ہیں۔“ نوین نے میرے عقب میں کھڑی دینا کا ہاتھ پکڑ کر آگے کیا۔

”اف کورس۔“ میں مسکرایا۔

”سائیکس ڈیئر فرینڈ یہ تو یہاں کی روایات ہیں جو اچھی بھی لگتی ہیں اب صرف آٹھ دن تو رہ گئے ہیں پھر اس کے بعد تم نے ہی اسے دیکھنا اور سنتا ہے تب پھر تم ان سارے لوگوں کو یاد کیا کرو گے اور سوچو گے کہ کاش میرے بن کے ہی یہ لوگ مجھے کسی کمرے میں بند کر دیتے۔“

”جوڑی تو ماشاء اللہ خوب زور دار ہے تیری۔“ ہارون نے میرے کان میں سرگوشی کی۔ میں ہنس دیا۔

”یار نوین انہیں اندر لے جاؤ، سب سے ملوؤ۔“ ہارون کہہ رہا تھا۔

”آئیں اویںہ اندر چلتے ہیں آج تو خوب مزا آرہا ہے تمام کزنز اکٹھے ہوئے ہیں۔“ وہ دونوں اسے لے کر اندرونی حصے کی طرف چلی گئیں میں وہیں لان میں کرسی کھینچ کر بیٹھ گیا ہارون بھی میرے سامنے ٹک

گیا۔

”اور سنا شنرا دے کیسی گزر رہی ہے، بہت خوش نظر آرہا ہے، لگتا ہے اویںہ سے خوب باتیں ہوئی ہیں تیری۔“ وہ میرا جگری یار ہمیشہ کی طرح میرے چہرے کے رنگ پہچان گیا تھا۔ میں کھلکھلا اٹھا اور مختصراً اسے گزری شام کا احوال سنا دیا۔

”ممنوع ہے بھی تیری۔ جبکہ اپنی تو شامت آئی ہوئی ہے۔ پہلے پتا ہوتا کہ پاکستان آکر یہ حالت ہوگی تو انکل کے پاؤں پڑ کر وہیں سرابند ہوا لیتا۔“ وہ جانے کیوں جڑا ہوا تھا۔

”کیا ہوا؟“

”یہ پوچھ کیا نہیں ہوا۔ آج پورے چار دن ہو گئے ہیں میں نے مریانہ کو دیکھا نہیں اس کی آواز تک نہیں سنی۔ اتنا ظالمانہ دستور ہے یہاں کا، ایک ہی گھر میں رہتے ہوئے اتنا سخت پردہ کروایا جا رہا ہے اسے، امی مجھے اندر کمروں میں گھسنے نہیں دیتیں بس اپنے کمرے میں جاتا ہوں وہاں سے اٹھتا ہوں تولان میں آ بیٹھتا ہوں، پھر اپنے کمرے میں یا گھر سے باہر عجیب زندگی ہو گئی ہے میری میں تو پریشان ہو گیا ہوں احتجاج کروں تو کوئی سنتا نہیں، ابوالک آ نکھیں نکالتے ہیں اس بے چاری پر پتا نہیں کیا بیت رہی ہے۔ اللہ جانے اسے کہاں باندھا ہوا ہے ان لوگوں نے اور تو اور لیزا آئی کی سن لو، فرماتی ہیں خبردار جو میری بیٹی سے ملا، اسے تب تک نہیں دیکھنے کا جب تک تمہارا شادی نہیں بن جاتا۔“ وہ تو اچھا خاصا تپا ہوا تھا لاوے کی طرح پھٹ پڑا۔

”ریلیکس ڈیئر فرینڈ یہ تو یہاں کی روایات ہیں جو اچھی بھی لگتی ہیں اب صرف آٹھ دن تو رہ گئے ہیں پھر اس کے بعد تم نے ہی اسے دیکھنا اور سنتا ہے تب پھر تم ان سارے لوگوں کو یاد کیا کرو گے اور سوچو گے کہ کاش میرے بن کے ہی یہ لوگ مجھے کسی کمرے میں بند کر دیتے۔“

”میری جان شادی سے پہلے لڑکا لڑکی میں یہ چند دنوں کی مکمل دوری اسی لیے کی جاتی ہے کہ وہ اپنے اندر اتنا اسٹیمناسٹور کریں کہ بعد میں ایک دوسرے

کو برداشت کر سکیں۔ میں نے اسے بھرپور تسلی

دی۔

”کوئی بات نہیں بچے اڑالے مذاق، تجھ پر بھی وقت

آئے گا تا تب پوچھوں گا اب بتا بیٹے پہاڑ اونٹ تلے

آیا ہے کہ نہیں۔“ وہ مجھے گھورتے غصے میں الٹا محاورہ

بول گیا تھا میں نے زوردار قہقہہ لگایا۔

”ابے گھامڑ پہاڑ اونٹ تلے نہیں آتا، اونٹ پہاڑ

تلے آتا ہے۔“

”ہاں ہاں وہی، آیا کہیں سے بڑا اردو دان جانتا ہوں

میں تجھے اب زیادہ کھی کھی نہ کر۔“ وہ برا مان گیا میں

مستل ہنس رہا تھا کہ بے عملت کوریڈور کی سیڑھیاں

اترتی دینا کو دیکھ کر ہنسی ضبط کی۔

”حدید چلیں۔“ وہ ہمارے پاس آرکی۔

”اتنی جلدی، ارے بھی ابھی تو آپ لوگ آئے

ہو، کچھ دیر تو ٹھہرو لیوں بھی ڈنر ٹائم تو ہو ہی چکا ہے۔“

ہارون نے اپنے زانویں درست کیے۔

”نہیں بہت دیر ہو گئی ہے اماں انتظار کر رہی ہوں

گی۔“ اس نے متفکر نگاہوں سے دیکھا۔

”اوکے یار، واقعی دیر ہو گئی ہے ہم کب کے گھر

سے نکلے ہوئے ہیں اب تیری شادی پر ہی ملاقات

ہوگی۔“ میں نے ہارون سے مصافحہ کے لیے ہاتھ

برہمایا۔

”اکیلے ہی منہ اٹھا کر نہ آ جانا سب کو لئے کر آنا اور

اوہ نہ آپ بھی ضرور آئے گا۔“ وہ اسے دعوت دے رہا

تھا اس نے آہستگی سے گردن ہلادی۔ میں نے ہارون

سے رخصت لی۔

ہارون کی شادی پھر اپنے بزنس کے لیے بھاگ دوڑ

اک خوبصورت سا گھر خریدنے کی لگن، میرے دن

رات انتہائی مصروف ہو چکے تھے میں اکثر صبح کا نکلا

رات گئے گھر واپس آتا، اس روز بھی میں بہت لیٹ

ہو گیا تھا امی میرے انتظار میں جاگ رہی تھیں۔ میں

شرمندہ ہو گیا وہ بہت غصے میں تھیں۔

”سوری امی، کچھ دیر ہو گئی، آپ سے تو کہا ہے آپ

سو جایا کریں ہیٹ کی چابی میرے پاس ہے، پھر بھی

آپ ٹینشن لیتی ہیں۔“ میں ان کے قدموں میں بیٹھ

گیا۔

”تو کیا نہ لوں، ماں ہوں تمہاری، اتنے دن گزارے

ہیں تمہاری جدائی میں، اب تو دل کرتا ہے ذرا دیر کے

کے لیے بھی نظروں سے اوجھل نہ کروں تمہیں اور تم ہو

کہ سارا سارا دن ہی غائب رہتے ہو۔ ذرا احساس

نہیں تمہیں میرا، آخر کیا کرتے پھر رہے ہو۔ میرا تو دل

ہولتا رہتا ہے اتنی فکر مند ہو رہی تھی میں۔“

”اوہ میری پیاری امی جان آپ کیوں فکر مند ہوتی

ہیں، مجھے باہر کئی کام ہیں آپ بس میرے لیے دعا کیا

سیجیے، جلد ہی میرا کاروبار سیٹ ہو جائے میں ایک پارا

سا گھر لے لوں تو پھر انشاء اللہ زیادہ ٹائم آپ کے ساتھ

گزاروں گا۔“ میں نے ان کی گود میں سر رکھ دیا۔

”دعائیں تو میں ہر مل کرتی ہوں اپنے بچے کے

لیے، خدا ہزار خوشیاں دے لیکن یہ گھر کا کیا چکر ہے،

ارے پنگے یہ گھر کیا برا ہے۔ ہمارے گزارے لائق

بہت ہے ہم یہیں ٹھیک ہیں۔ میں بتا رہی ہوں میں

کہیں اور نہیں جانے کی۔ ساری عمر یہیں گزری ہے

میری ماں بھی یہیں ہے، تم باقی باتیں چھوڑ کر بس اب

گھر والی لانے کی سوچو۔“ انہوں نے میرے سنورے

بال بگاڑ دیئے۔

”پاہ، گھر والی۔“ میں نے آنکھیں موند لیں، کتنا

دلکش تصور تھا۔

”کیوں باقی اتنی فکریں خود کو لگا رکھی ہیں۔ کیا یہ

فکر نہیں ہے تمہیں، میں تو دن رات دعا کرتی ہوں خدا

وہ خیر کی گھڑی لائے میرے آگن میں بھی خوشیاں

اتریں، میرے دل کا ارمان پورا ہو۔ تمہاں کرو تو میں مل

ہی اماں سے بات کروں۔“

”اماں سے بات۔“ میں یکدم سیدھا ہو بیٹھا۔

”یہ کیا کہہ رہی ہیں امی؟“

”کیوں تمہیں کوئی اعتراض ہے۔“ امی کا چہرہ

میرے یوں بوکھلانے پر یک لخت رنگ بدل گیا۔

ماسترز مکمل کر لے میرے سارے کام بھی ہو جائیں، پھر شادی کا سوچیں گے۔“ میں نے اپنے خیال کا اظہار کیا۔ حالانکہ جب سے اس پر حال دل عیاں کیا تھا۔ تب سے مستقل اک بے کلی دامن گیر ہو گئی تھی۔ اس کے بعد پھر میرا اس سے سامنا ہی بہت کم ہوا تھا اور جو ہوا بھی تھا تو میں بات کرتے کرتے رہ گیا۔ لیکن اب جو امی نے خوش خبری سنائی۔ اس نے مجھے یک لخت ہلکا پھلکا کر دیا۔ کیسا جاں فزا احساس تھا کہ وہ میرے نام سے منسوب ہے، وہ میری ہے۔ میں ساری سسک بھول گیا۔ مگر وہیں امی کی اگلی بات نے مجھے چونکا دیا۔ ”لو بھلا کیسا ماسترز کیا تمہیں نہیں پتا چھوٹی نے پڑھنا چھوڑ دیا ہے۔“

”واٹ۔“ مجھے اس انکشاف پر سخت اچنکھا ہوا۔ ”اے لوس۔ اسے تو بڑے دن ہو چلے ہیں یونیورسٹی چھوڑے ہوئے۔ بیمار پڑ گئی تھی۔ بڑی چھٹیاں ہو گئی تھیں اس کی پھر اس کے بعد گئی ہی نہیں۔ کتنی تھی اب پڑھنے کو جی نہیں چاہتا جی اجاٹ ہو گیا ہے۔ یوں بھی اپنی پڑھائی کا کیا کرنا، جب لڑکی نے سولہ اٹھارہ جماعتیں پڑھ کر بھی چولہا چوکا ہی سنبھالنا ہے۔

مگر ہستی ہی کرنی ہے تو وہ دس جماعتیں پڑھ کر بھی سنبھال سکتی ہے۔ لازمی تو نہیں اتنا مغز پیچ کرے اور اب ادینہ وہ پہلے والی ادینہ بھی نہیں رہی۔ اب تو بہت ذمہ دار اور سمجھ دار ہو گئی ہے۔ دیکھا نہیں کیسے سارا گھر سنبھال رکھا ہے۔ اماں بھی خوش اور پرسکون ہیں۔ ورنہ تو جب وہ یونیورسٹی جاتی تھی تو بے چاری اماں کو اپنی بوڑھی ہڈیاں گھسالی پڑتی تھیں۔ جس کی وجہ سے آئے دن ان کا لی لی ہالٹی رہتا تھا تو بھی جوڑوں میں درد ادینہ سے الگ ان کی ٹھنی رہتی تھی۔ ہر وقت ہی کل کل ہوتی تھی وہاں۔ شکر کیا تھا جو ادینہ بھی خود عقل کر لی۔ میں نے بھی اسے سمجھایا تھا کہ مت کھپاؤ اتنا دل غ۔ جو چار جماعتیں پڑھ لی ہیں وہی بہت ہیں۔

تم نے کون سا نوکری کرنا ہے۔ یوں بھی یونیورسٹی آنے جانے کے چکروں نے تو اس کی صحت ہی خراب کر دی تھی۔ رنگ تو ایسا سالوا لیا تھا کہ پوچھو

”نن، نہیں، کوئی اعتراض تو نہیں، لیکن اماں سے کیا بات کریں گی آپ۔“

”اچھا اب بنو نہیں بے وقوف یوں حیران ہوا کہ مجھے ہی ڈرا دیا۔ لو بھلا پوچھتا ہے اماں سے کیا بات کریں گی آپ۔ ارے بھئی ان سے یہی کہوں گی کہ اب وہ میری امانت میرے حوالے کریں۔“ انہوں نے مزے سے بتایا۔ اور میں کچھ کچھ سمجھ کر بھی انجان بن گیا۔

”امانت کیسی امانت؟“

”چل ہٹ باولا نہ ہو تو۔ اب معصوم بن رہا ہے میرے آگے، جیسے میں تجھے جانتی نہیں۔ اچھی طرح پہچانتی ہوں تیری آنکھوں کے رنگ جو تیرے دل میں ہے نا، وہی میری بھی خواہش، اسی لیے تو تیرے جاتے ہی اماں کے کان میں بات ڈال دی تھی کہ چھوٹی کی فکر کرنے کی ضرورت نہیں وہ میرے حدید کی دلہن بنے گی اور خیر سے تم آگے ہو تو اب اماں بھی انتظار میں ہیں کہ کب بات آگے بڑھے۔“ انہوں نے بتایا اور میں اتنی ہی خوشی سے دیوانہ ہو گیا۔

”سچ امی۔“ میں بے اختیار ان سے لپٹ گیا۔

”ارے ارے لڑکے چھوڑ مجھے ہڈیاں توڑے گا میری۔“ میں کچھ زیادہ ہی مسرت کا اظہار کر گیا تھا۔ امی چیخیں تو میں شرمندہ ہوتا ان سے الگ ہو گیا۔

”سوری امی۔“

”بے وقوف۔“ انہوں نے ہنستے ہوئے میرا ماتھا چوم لیا۔

”میں جلدی اماں اور بھائی سے بات کرتی ہوں اور شادی کے لیے کوئی قریب ہی کی تاریخ مانگ لیتی ہوں گھر ہی کی تو بات ہے۔ زیادہ تیاری کیا کرنی ہے۔ خدا خیر کرے بعد میں پھر خود ہی اپنی پسند سے خرید لی رہے گی آج کل تو موئے فیشن بھی صبح کچھ تو شام تک کچھ ہو جاتے ہیں۔“ وہ اپنے تئیں سب سوچے بیٹھی تھیں۔

”آپ بات ضرور کیجیے امی۔ مگر ابھی شادی کی ایسی کوئی جلدی نہ چائیں ابھی تو میں بھی بے حد مصروف ہوں۔ پھر دینا بھی پڑھ رہی ہے۔ وہ اطمینان سے اپنا

خواب! بھلا کیا ہوتے ہیں یہ خواب؟ اور آنکھیں کیوں دیکھتی ہیں خواب؟ اس لیے کہ یہ عین فطرت ہے یا انسانی جبلت کہ جو اسے سعی و جستجو، شوق و خواہش ابتدا انتہا کے سارے راستے بتاتی ہے۔ ایک جہاں نسخہ ہو گیا تو اس سے آگے اور آگے کیا ہے؟ یہ لگن اسے کہیں ٹھہرنے نہیں دیتی۔ اک منزل سے اگلی منزل کا تعین اک خوش کن تصور باندھتا، دل ناداں کو ہلائے رکھنے کے بہانے ہی تو خواب ہیں اور کچھ لوگ ہوتے ہیں ایسے لوہہ افضل جیسے بے صبرے اور بے قرار جن کے خمیر میں ہی بے چینی، بے اطمینانی ہوتی ہے جو کسی مقام پر مطمئن ہوتے ہی نہیں اور ابھی اور ان کے طمع کی کوئی انتہا نہیں ہوتی جو روز امیدوں کی ڈوری کو اک نئی گرہ لگانا فرض اولین جانتے ہیں۔ جو تقدیر سے زیادہ تدبیر کو آزمانا چاہتے ہیں اور جن کی ناقص عقل یہ نہیں جانتی کہ اس چاہت میں وہ خود کو ہی آزمائش کے حوالے کر چکے ہیں۔



میں بچپن سے ہی ایسی ہوں، شاید ماں کا پیار ماں کی گود، ماں کی تربیت نہیں ملی پھر مجھے پالتے والے ڈھیروں ہاتھ تھے بہر حال جو بھی تھا میں شروع ہی سے اتاؤلی اور خود پسند رہی ہوں۔ میں اور بس میں۔ اس سے آگے مجھے کسی سے سروکار نہیں تھا۔ چھوٹی سی تھی تو کھانے پینے کی بڑی شوقین تھی بابا کی عادت تھی ہر شام گھر واپسی پر کوئی نہ کوئی پھل یا کوئی مٹھائی وغیرہ لے آتے۔ اماں سب کا حصہ الگ کرتیں اور میں اپنا تیر ہدف نسخہ آزما تے ہوئے کھا بھاڑنے لگتی۔ ابابجھے ہسلا پھسلا کر گود میں بیٹھاتے اور سب کا سب اٹھا کر میرے آگے ڈھیر کر دیتے، اماں بہتیرا وادیا مچاتیں، بابا کو ٹوکنتیں سمجھاتیں اور مجھ میں تو بابا کی جان تھی کسی نہ کسی طرح اماں کو ٹال دیتے۔ وہ بڑ بڑائے جاتیں اور میں مزے لے لے کر کھائے جاتی، یہ اچھا ہے، یہ پھکا ہے، یہ گندہ ہے، یہ کڑوا ہے، میں کچھ چکھتی، کچھ کھاتی، یوں مجھ سے جو بچا کچھارہ جاتا وہ باقی

ہی مست۔ یہ تو اس نے جب سے پڑھائی کا بوجھ سر سے اتارا ہے تو پھر ہی منہ پر کوئی رونق نظر آنے لگی ہے۔ ورنہ تو نہ اسے اپنا ہوش ہونا تھا، نہ کھانے پینے پر توجہ۔ امی جانے کیا کیا بتا رہی تھیں اور میں دینا گے اس اقدام پر محو حیرت تھا۔

اس کا تو اولین خواب تھا یونیورسٹی میں پڑھنا، اسٹریز کرنا، لیکن یہ کیا اس نے اپنا یہ خواب ادھورا کیوں کر دیا۔ جبکہ پولیس میں وہ بہت اچھے مار کس لے کر کامیاب ہوئی تھی۔ وہ کیوں اپنے ایک سال کی محنت ضائع کر رہی ہے پائل ہو گئی ہے وہ۔ آخر ایسی کیا وجہ ہوئی ہے اور اس نے مجھے بتایا بھی نہیں۔ مجھ سے ہر بات شیئر کرنے والی دینا نے اتنی بڑی بات مجھ سے چھپائی کیوں بھلا۔ میں پریشان سا سوچ رہا تھا آخر دینا نے ایسا کیا تو کیوں؟

اور اگلے ہی دن میں اس سوال کا جواب لینے اس سے ملنے آیا تھا وہ تو مجھے نہ ملی وہ کاملہ بابا کی طرف گئی ہوئی تھی لیکن مجھے اس سوال کا جواب مل گیا تھا اور سوچتا ہوں کاش میں اس کھوج میں نہ پڑتا یہ سوال میرے دل میں نہ آتا۔ میں اس الجھن کو نہ ہی سلجھانے کی کوشش کرتا۔ اس گرہ کو یوں ہی گے رہنے دیتا تو اچھا تھا کیا ملا مجھے اس گرہ کو کھول کر کاش اسے کاش۔



بال آیا نہ چھٹک کے ٹوٹے
ٹوٹا جن کا مقدر تھا ٹوٹے
لسبہ الفاظ تو جواب آنکھوں میں
وہ ستارے ہوں کہ ساغر ٹوٹے
حسن تخلیق کی توہین ہوئی
ناز نحیل کی شہ پر ٹوٹے
نذر تادیب بے ناکفہ ہیاں
تاثر شیدہ بھی پیکر ٹوٹے
تم اک امید کی خاطر روئے
اس صنم زار میں آذر ٹوٹے

اس نے لاڈ اٹھانے تھے۔ حدید شروع ہی سے میرا بہت خیال رکھتا تھا میں بھی اپنے بھائی بہنوں سے زیادہ اس کے قریب تھی، اسکول گئے قہے، سپیلیوں کی باتیں، نیچرز کی شکایتیں سب اس سے کرتی وہ بھی بڑے انسماک سے سنتا۔

وقت کے ساتھ ساتھ میرا احساس کمتری بڑھتا ہی گیا۔ اماں کی بات سچ ہوئی تھی وہ جو پہلے پہل میں بستے اور جوتوں سے متاثر ہوئی تھی تو اب مجھے گھر کا گھر ہی برا لگتا اماں کے لاکھ منع کرنے کے باوجود میں نے اسکول میں بے شمار مسہیلیں بنائی تھیں اور اکثر ان کے گھر بھی چلی جاتی۔ وہ چار کے گھر تو ایسے تھے جیسے کہ محل۔

ان کا پینٹا اوڑھتا، رہن سہن، کھانا پینا ایسا شاندار تھا کہ وہ سب دیکھ کر مجھے اپنے گھر کی ہر چیز سے نفرت ہونے لگتی۔ کھانا پینا تو انتہائی زہر لگنے لگا، آئے دن وہی سبزی ترکاری، دال، اچار، میں سو سو کپڑے نکالنے کی عادی ہوتی گئی جس پر اماں سے خوب باتیں بھی سنتی اور کبھی کبھار تو ایک آدھ تھپڑ بھی کھانا پڑتا۔

بابا کی آمدن تو ٹھیک ٹھاک تھی، ہم بھی خوشحال ہو سکتے تھے اگر جو بد قسمتی سے اماں اعلا درجے کی بچت پرائل نہ ہوتیں، انہیں تو جیسے ایک سوچہ ڈکری کفایت کا بخار تھا بابا کی کمائی کا آدھے سے زیادہ حصہ وہ اپنے پرانے منحوس بکسے میں ڈال دیتیں اور اس کی چابی بھی اللہ جانے کہاں چسپائی تھیں کہ میری ہزار جاسوسیوں پر بھی کبھی دریافت نہ ہو سکی۔ وہ تو ہمیں ایسا ترسنا سا کرپال رہی تھیں کہ کیا کوئی یتیم رشتہ دار کو ہالتا ہو گا اور صد افسوس وہ اپنے اس طریقہ کار پر مطمئن بھی تھیں جبکہ مجھے ان کی انہی حرکتوں سے از حد چڑھی۔

ایک بار تو میں نے بابا کو کہہ بھی دیا کہ وہ اپنی ساری انکم مجھے دیا کریں پھر دیکھیں ہمارا طرز زندگی کیسے بدلتا ہے بابا تو میری بات پر مسکرا دیئے پر اماں نے میرے وہ لٹے لیے کہ اللہ کی پناہ، میرے دل میں پتی ان کے لیے کدورت میں اور اضافہ ہوا۔ ان حالات میں میری پلکوں نے — بڑے خوابوں کا بوجھ اٹھانا شروع کر دیا

سب کو کھانا پڑتا۔

نت نئی آلتیں بچانا آئے دن کوئی نہ کوئی نقصان کرنا بھی میرے معاملات میں شامل تھا اپنے سب کھلونے توڑ بیٹھتی تو صارم کی چیزوں کی شامت آتی وہ بے چارا رو رو کر ہلکان ہوا جاتا اماں الگ سر پکڑ کر بیٹھی ہوتیں۔

اور جب ایک کی ڈانٹ اور اس پردسیوں کی حمایت حاصل ہو تو تانپختہ کم سن ذہن ڈانٹنے والے کو ہی برا سمجھتا ہے، مجھے بھی دادی بری لگنے لگی تھیں۔

بڑی دونوں محلے کے سرکاری اسکول میں پڑھتی تھیں جب میں اسکول ایج کو پہنچی تو قریب ہی پرائیویٹ اسکول بھی کھل چکا تھا اب خود مجھے بڑے شوق سے لے جا کر داخل کروا آئے وہاں تقریباً سارے ہی بچے اچھے کھاتے پیتے گھرانوں سے تھے۔ جن کے نت نئے خوبصورت بیگ، ٹیٹس، کاپیاں، رنگ برنگی پنسل، صاف ستھرے یونیفارم، شوز دیکھ کر پہلی بار مجھے اپنی کم قیمت چیزیں نہایت بری لگیں جس کا اظہار میں گاہے بگاہے کرتی رہتی اور بابا، دادی کی ناگواریت کے باوجود میری خواہش کو پورا کرنے کے لیے جتنے رہتے۔

جوں جوں شعور آتا گیا میں زیادہ خرابی ہوتی گئی۔ یہ نہیں کھانا وہ نہیں پینا یہ لیتا ہے وہ نہیں چاہے، عید، شب برات پر بھی کاملہ اور ماتہ آیا حتی کہ صارم کے بھی کپڑے جوتے اماں خود ہی لے آتیں، اور مجھے اماں کی لائی چیز کبھی پسند نہ آتی، سو سو نقص نکالتی جس سے چڑ کر اماں نے میرے لیے خریداری کرنا موقوف کر دی، میں پھوپھو کے ساتھ خود جا کر اپنی پسند سے لیتی، اور اب تو میری فرمائشیں پوری کرنے والوں میں بابا کے علاوہ میری اکلوتی پھوپھو کا نور نظر حدید بھی تھا کہ وہ مجھ سے بڑا تھا لیکن میں اس کی بڑے پن کو خاطر میں نہ لاتی۔ وہ خود کو میرا دوست کہتا اور میں خود دوستوں سے تکلف کی قائل نہ تھی۔

اسے ٹھیک ٹھاک جب خرچ ملا کرتا تھا جو وہ آدھے سے زیادہ مجھ پر خرچ کر دیتا میں بھی خوب حق سمجھ کر وصول کرتی آخر اس کا اور کوئی بہن بھائی تھا جس کے